اُردو گلدستہ

اردو کی معاون درسی کتاب آٹھویں جماعت کے لیے

© NCERT not to be republished

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ
NATIONAL COUNCIL OF EDUCATIONAL RESEARCH AND TRAINING

4815- Urdu Guldasta
(Supplementary Reader) for Class VIII

ISBN 978-81-7450-827-0

جُملہ حقوق محفوظ

- ناشر کی پہلے سے اجازت حاصل کیے بغیر، اس کتاب کے کسی بھی حصے کو دوبارہ پیش کرنا، یادداشت کے ذریعے بازیافت کے سسٹم میں اس کو محفوظ کرنا یا ترقیاتی، میکانیکی، فوٹو کاپینگ، ریکارڈنگ کے کسی بھی وسیلے سے اس کی ترسیل کرنا منع ہے۔
- اس کتاب کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جارہا ہے کہ اسے ناشر کی اجازت کے بغیر، اس شکل کے علاوہ جس میں کہ یہ چھاپی گئی ہے یعنی، اس کی موجودہ جلد بندی اور سرورق میں تبدیلی کرکے، تجارت کے طور پر نہ تو مستعار دیا جاسکتا ہے، نہ دوبارہ فروخت کیا جاسکتا ہے، نہ کرایہ پر دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی تلف کیا جاسکتا ہے۔
- کتاب کے صفحہ پر جو قیمت درج ہے وہ اس کتاب کی صحیح قیمت ہے۔ کوئی بھی نظرثانی شدہ قیمت چاہے وہ ربر کی مہر کے ذریعے یا چپکنی یا کسی اور ذریعے ظاہر کی جائے تو وہ غلط متصوّر ہوگی اور ناقابل قبول ہوگی۔

پہلا ایڈیشن

فروری 2008 ماگھ 1929

دیگر طباعت

دسمبر 2012 اگھن 1934
جون 2017 آشاڑھ 1939
فروری 2019 ماگھ 1940
نومبر 2019 کارتک 1941
دسمبر 2021 اگہن 1943

PD 6+1T SPA

© نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، 2008

قیمت : ₹ 65.00

این سی ای آر ٹی واٹر مارک 80 جی ایس ایم کاغذ پر شائع شدہ

سکریٹری، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، شری اروندو مارگ، نئی دہلی نے تاج پرنٹرس، 69/6A نجف گڑھ روڈ، انڈسٹریل ایریا نیئر کیرتی نگر میٹرو اسٹیشن، نئی دہلی - 110 015 میں چھپوا کر پبلی کیشن ڈویژن سے شائع کیا۔

این سی ای آر ٹی کے پبلی کیشن ڈویژن کے دفاتر

این سی ای آر ٹی کیمپس
سری اروندو مارگ
نئی دہلی - 110016 **فون** 011-26562708

108,100 فٹ روڈ ہوسڈے کیرے ہیلی
ایکسٹینشن بناشنکری III اسٹیج
بینگلورو - 560085 **فون** 080-26725740

نوجیون ٹرسٹ بھون
ڈاک گھر، نوجیون
احمد آباد - 380014 **فون** 079-27541446

سی ڈبلیو سی کیمپس
بمقابل ڈھانکل بس اسٹاپ، پانی ہاٹی
کولکاتا - 700114 **فون** 033-25530454

سی ڈبلیو سی کامپلیکس
مالی گاؤں
گواہاٹی - 781021 **فون** 0361-2674869

اشاعتی ٹیم

ہیڈ، پبلی کیشن ڈویژن : انوپ کمار راجپوت
چیف ایڈیٹر : شویتا اُپّل
چیف پروڈکشن آفیسر : ارون چتکارا
چیف بزنس منیجر : وپن دیوان
ایڈیٹر : سید پرویز احمد
پروڈکشن آفیسر : اے۔ایم۔ونود کمار

سرورق اور آرٹ
وی۔ منیشا

© NCERT not to be republished

پیش لفظ

'قومی درسیات کا خاکہ—2005' میں سفارش کی گئی ہے کہ بچّوں کی اسکول کی زندگی، ان کی باہر کی زندگی سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ یہ زاویۂ نظر، کتابی علم کی اس روایت کی نفی کرتا ہے جس کے باعث آج تک ہمارے نظام میں گھر اور سماج کے درمیان فاصلے حائل ہیں۔ نئے قومی درسیات کے خاکے پر مبنی نصاب اور درسی کتابیں اسی بنیادی خیال پر عمل آوری کی ایک کوشش ہے۔ اس کوشش میں مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور رٹ کر پڑھنے کے طریقۂ کار کی حوصلہ شکنی بھی شامل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان اقدامات سے قومی تعلیمی پالیسی 1986 میں مذکور 'تعلیم کے طفل مرکوز نظام' کی طرف مزید پیش رفت ہوگی۔

اس کوشش کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ سبھی اسکولوں کے پرنسپل اور اساتذہ بچوں میں اپنے تاثرات خود ظاہر کرنے اور ذہنی سرگرمیوں اور سوالوں کے ذریعے سیکھنے کی ہمّت افزائی کریں۔ ہمیں یہ ضرور تسلیم کرنا چاہیے کہ بچوں کو اگر موقعہ، وقت اور آزادی دی جائے تو وہ بڑوں سے حاصل شدہ معلومات سے وابستہ ہوکر، نئی معلومات مرتّب کرتے ہیں۔ آموزش کے دوسرے ذرائع اور محل وقوع کو نظر انداز کرنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک اہم سبب مجوّزہ درسی کتاب کو امتحان کے لیے واحد ذریعہ بنانا ہے۔ بچّوں کے اندر تخلیقی صلاحیت اور پیش قدمی کے رجحان کو فروغ دینا اسی وقت ممکن ہے جب ہم آموزشی عمل میں بچوں کو بحیثیت شریک کار قبول کریں اور اُن سے اسی طرح پیش آئیں۔ انھیں محض مقررہ معلومات کا پابند نہ سمجھیں۔

یہ مقاصد اسکول کے معمولات اور طریقۂ کار میں معقول تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ روزمرہ نظام الاوقات (Time-Table) میں لچیلا پن اُسی قدر ضروری ہے جتنی کہ سالانہ کیلینڈر کے نفاذ میں سخت محنت کی تاکہ مطلوبہ ایام کو حقیقتاً تدریس کے لیے وقف کیا جاسکے۔ تدریس اور انداز قدر کے طریقوں سے بھی اس امر کا تعین ہوگا کہ یہ درسی کتاب، بچوں میں ذہنی تناؤ اور اکتاہٹ کا ذریعہ بننے کے بجائے ان کی اسکولی زندگی کو خوش گوار بنانے میں کس حد تک مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ نصابی بوجھ کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نصاب سازوں نے مختلف سطحوں پر معلومات کی تشکیلِ نو اور اسے نیا رخ دینے کی غرض سے بچوں کی

نفسیات اور تدریس کے لیے دستیاب وقت پر زیادہ سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی ہے۔ اس مخلصانہ کوشش کو مزید بہتر بنانے کے لیے یہ درسی کتاب سوچنے اور محسوس کرنے کی تربیت، چھوٹے گروپوں میں بحث ومباحثہ کرنے اور عملاً انجام دی جانے والی سرگرمیوں کو زیادہ اوّلیت دیتی ہے۔

این سی ای آر ٹی اس کتاب کے لیے تشکیل دی جانے والی ''کمیٹی برائے درسی کتاب'' کی مخلصانہ کوششوں کی شکر گزار ہے۔ کونسل زبانوں کی مشاورتی کمیٹی برائے زبان کے چیئرمین پروفیسر نامور سنگھ اور اس کتاب کے خصوصی صلاح کار پروفیسر شمیم حنفی کی ممنون ہے۔ اس درسی کتاب کی تیاری میں جن اساتذہ نے حصّہ لیا، ہم ان کے متعلقہ اداروں کے بھی شکر گزار ہیں۔ ہم ان سبھی اداروں اور تنظیموں کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنے وسائل، مآخذ اور عملے کی فراہمی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ ہم وزارت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومتِ ہند کے شعبے برائے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کی جانب سے پروفیسر مرنال مری اور پروفیسر جی۔ پی۔ دیش پانڈے کی سربراہی میں تشکیل شدہ نگراں کمیٹی (مانیٹرنگ کمیٹی) کے اراکین کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت اور تعاون ہمیں دیا۔ باضابطہ اصلاح اور اپنی اشاعت کے معیار کو مسلسل بہتر بنانے کے مقصد کی پابند ایک تنظیم کے طور پر این سی ای آر ٹی تمام مشوروں اور آرا کا خیر مقدم کرتی ہے تاکہ کتاب کو مزید غور وفکر کے بعد اور زیادہ کارآمد اور بامعنی بنایا جاسکے۔

نئی دہلی
30 نومبر 2007

ڈائریکٹر
نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

© NCERT not to be republished

اس کتاب کے بارے میں

کونسل کے ذریعے پیش کی جانے والے یہ نئی معاون درسی کتاب 'اردو گلدستہ' آٹھویں جماعت کے طالب علموں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ سفرنامے، انشائیے اور ایک کہانی پر مشتمل اس کتاب میں نو اسباق شامل کیے گئے ہیں۔ طالب علموں کی ذہنی سطح اور ضرورت کے مطابق آسان اور دلچسپ فن پاروں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انھیں پڑھ کر طالب علموں میں غور و فکر کی عادت پیدا ہو اور وہ آزادانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کر سکیں۔ ہر سبق کے آخر میں سوالات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر مصنّف کے بارے میں مختصر حالات زندگی بھی شامل کیے گئے ہیں۔

اس خیال سے کہ طلبا پر نصاب کا بوجھ زیادہ نہ ہو، کتاب کی ضخامت کم رکھی گئی ہے۔ کتاب کی تیاری کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو اردو اساتذہ، ماہرین اور ایک خصوصی صلاح کار پر مشتمل تھی۔ ان سبھی کے اشتراک و تعاون سے اس کتاب کو آخری شکل دی گئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مطلوبہ معیار کے مطابق طلبا صحیح اردو سیکھ سکیں گے اور اپنے ادب سے بھی روشناس ہو سکیں گے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اردو کی بعض دوسری کتابوں کا مطالعہ کرنے میں بھی دلچسپی لیں گے۔

اردو اساتذہ سے درخواست ہے کہ وہ اس کتاب سے متعلق اپنے عملی اور تدریسی تجربات کی روشنی میں ہمیں اپنے مشوروں سے نوازیں تاکہ آئندہ اس کتاب کو مزید بہتر بنایا جا سکے۔

© NCERT not to be republished

کمیٹی برائے معاون درسی کتاب

چیئرمین، مشاورتی کمیٹی برائے زبان

نامور سنگھ، پروفیسر ایمرٹس، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

خصوصی صلاح کار

شمیم حنفی، ریٹائرڈ پروفیسر، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

چیف کوآرڈی نیٹر

رام جنم شرما، سابق پروفیسر اور ہیڈ، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن اِن لینگویجز، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی

اراکین

احمد محفوظ، سینئیر لیکچرر، شعبۂ اردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

خالد اشرف، ایسوسی ایٹ، شعبۂ اردو، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

خالد جاوید، لیکچرر، شعبۂ اردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

خالد محمود، ریڈر، شعبۂ اردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زبیدہ حبیب، ریڈر، ٹی ٹی آئی کالج، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مجتبیٰ حسین، ریٹائرڈ ایڈیٹر، این سی ای آر ٹی، مافار ریجینسی، اے سی گارڈ، حیدرآباد، آندھرا پردیش

محمد عارف عثمانی، ٹی جی ٹی اردو، اینگلو عربک سینئیر سیکنڈری اسکول، اجمیری گیٹ، دہلی

© NCERT not to be republished

مسرّت جہاں، سینئیر لیکچرر، سیکنڈری ٹریننگ کالج، مہاپالیکا روڈ، ممبئی، مہاراشٹر

سلیم اختر، ٹی جی ٹی اردو، جامعہ سینئیر سیکنڈری اسکول، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ذکی طارق، ڈسٹرکٹ کو آرڈی نیٹر، ڈسٹرکٹ لٹریسی مشن، وکاس بھون کلکٹوریٹ، راج نگر، غازی آباد، اتر پردیش

ممبر کوآرڈی نیٹر

چمن آراخاں، ایسوسی ایٹ پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن اِن لینگویجز، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی

© NCERT not to be republished

اظہارِ تشکر

اس کتاب میں جن مصنفین کے سفرنامے اور انشائیے شامل ہیں کونسل ان سبھی کی شکرگزار ہے۔ اس کتاب کی تیاری کے لیے کونسل کا پی ایڈیٹر ڈاکٹر ارشاد نیّر، پروف ریڈرس عظیم الدین، اسسٹنٹ ایڈیٹر محمد اکبر اور حسن البنّا، ڈی ٹی پی آپریٹرز شائلہ فاطمہ، فلاح الدین فلاحی، محمد وزیر عالم اور نرگس اسلام اور کمپیوٹر اسٹیشن انچارج پرش رام کوشک کی تہہ دل سے شکرگزار ہے۔

© NCERT not to be republished

ترتیب

	پیش لفظ		*iii*
	اس کتاب کے بارے میں		*v*
1.	لِلی پُٹ کا سفر	جوناتھن سوئفٹ: مترجم احمد خاں خلیل	1
2.	ہندستان جنّتِ نشان	صالحہ عابد حسین	7
3.	سندباد جہازی کا دوسرا سفر	الف لیلہ سے ماخوذ	13
4.	مجھے میرے بزرگوں سے بچاؤ	کنہیالال کپور	20
5.	چند مناظرِ قدرت	ابنِ انشا	25
6.	اردو کا ایک انوکھا ادیب ابنِ صفی	ادارہ	32
7.	دادی کا شاندار باورچی خانہ	رسکن بونڈ	35
8.	ایوریسٹ کی فتح	بچندری پال	43
9.	دُنیا کی کہانی	پروفیسر محمد مجیب	49

© NCERT not to be republished

گاندھی جی کا طلسم

میں تمھیں ایک طلسم دیتا ہوں۔ جب بھی تم شک وشبہ میں مبتلا ہو جاؤ یا تمھارا نفس تم پر حاوی ہونے لگے تو اس تجربہ کو آزماؤ:

جو سب سے غریب اور کمزور آدمی تم نے دیکھا ہو اُس کی شکل یاد کرو اور اپنے آپ سے پوچھو کہ جو قدم اُٹھانے کے بارے میں تم سوچ رہے ہو وہ اُس آدمی کے لیے کتنا مفید ہوگا۔ کیا اس سے اُسے کچھ فائدہ پہنچے گا؟ کیا اس سے وہ اپنی زندگی اور مقدر پر کچھ قابو پا سکے گا؟ دوسرے لفظوں میں کیا اس سے اُن کروڑوں لوگوں کو سوراج مل سکے گا جن کے پیٹ بھوکے اور رُوحیں بے چین ہیں۔

تب تم دیکھو گے کہ تمھارا شبہ مٹ رہا ہے اور نفس زائل ہو رہا ہے۔

مو. ک. گاندھی

© NCERT not to be republished

4815CH01

لِلی پُٹ کا سفر

جوناتھن سوئفٹ

(Jonathan Swift)

پیدائش : 1667 (آئرلینڈ) وفات : 1745

جوناتھن سوئفٹ کا شمار انگریزی کے مشہور طنز نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا وطن آئرلینڈ تھا۔ ان کی تحریروں میں آئرش عوام کے دکھ درد کا بیان نہایت خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ انتقال سے پہلے سوئفٹ ایک شدید دماغی مرض کے شکار ہو گئے تھے۔

یہ سبق سوئفٹ کی مشہور کتاب "Gulliver's Travels" سے ماخوذ ہے۔ اس کتاب کے کچھ حصوں کا ترجمہ احمد خاں خلیل نے ''گُلی ور کے تین حیرت انگیز سفر'' کے نام سے کیا ہے۔ یہ سبق اسی ترجمے سے ماخوذ ہے۔ سوئفٹ نے اپنی یہ کتاب 1726 میں لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے اپنے زمانے میں انسانیت کے زوال اور عام سماجی صورت حال پر گہرا طنز کیا ہے اور اس کے لیے دلکش تخیلاتی فضا کا سہارا لیا ہے۔

میرا نام گُلی وَر ہے۔ میں شمالی انگلستان کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے والد کاشت کار تھے۔ ان کی تھوڑی سی زمین پر ہمارا پورا کنبہ گزر بسر کرتا تھا۔ ہم پانچ بھائی تھے۔ میں سب سے چھوٹا تھا۔ ہمارے والدین ہم سب سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی زبردست خواہش تھی کہ ہم تعلیم حاصل کریں۔ لیکن اخراجات روز بہ روز بڑھ رہے تھے اور میں نے یہ محسوس کیا کہ اب مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ میں اسکول چھوڑ کر روزگار کی تلاش میں نکلا۔ مجھے ایک بحری جہاز ''اینٹی لوپ'' پر نوکری مل گئی۔

اینٹی لوپ جہاز کے کپتان کا نام پری چرڈ (Prechard) تھا۔ مئی 1700 میں یہ جہاز بحر جنوبی کی طرف

روانہ ہوا۔ ہماری منزل وہ جزیرے تھے جنھیں جزائر شرق الہند کہتے ہیں۔ سمندر میں تیز ہواؤں کی وجہ سے بڑی بڑی موجیں اُٹھنا روز کا معمول تھا۔ ایک دن تو اتنی تیز ہوا چلی کہ وہ جہاز کو کسی اور طرف دھکیل کر لے گئی اور ہم وان دیمن لینڈ (یعنی تسمانیہ) کے شمال میں جا پہنچے۔ اس طوفان میں ملاّحوں کو مسلسل کام کرنا پڑا، کوئی کنارہ نظر نہ آتا تھا۔ سخت محنت اور خراب غذا سے ہمارے بارہ آدمی مر گئے۔ ایک دن صبح بڑی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ دُور دُور تک کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ پھر بھی ہمارے ایک آدمی کو ایک چٹان نظر آئی۔ کپتان نے جہاز کو چٹان سے بچانے کی بہت کوشش کی، لیکن ہوا نے جہاز کو اس چٹان پر دے مارا۔ جہاز کے پیندے میں سوراخ ہو گیا۔ ہمارے چھے آدمی ایک کشتی کو لے کر سمندر میں اُترے لیکن ہوا کیا تھی ایک آفت تھی۔ اس نے کشتی کو اُلٹ دیا۔

مجھے یہ نہیں معلوم کہ میرے باقی ساتھیوں کا کیا ہوا۔ شاید وہ ڈوب گئے تھے، لیکن موجیں مجھے اُٹھائے اُٹھائے لیے جا رہی تھیں۔ میں نے کوشش کی کہ پاؤں نیچے لگا کر دیکھوں کہ زمین قریب تو نہیں، مگر پاؤں زمین پر لگتے ہی نہ تھے۔

خشک زمین

میں اسی کش مکش میں تھا اور بار بار یہی خوف پیدا ہوتا کہ موت قریب ہے۔ اچانک میرے پیر زمین پر جا لگے۔ اب ہوا کچھ تھم گئی تھی۔ ایک کلومیٹر تک میں پانی میں چلتا گیا۔ پھر خشک زمین آ گئی۔ اس وقت میری جان میں جان آئی۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ میں تھکن سے چُور تھا۔ پھر بھی ہمت کر کے آگے چلا۔ مجھے نہ کوئی آدمی نظر آیا نہ کوئی بستی۔ ویسے بھی میں تھکن کی وجہ سے پورے ہوش میں نہ تھا۔ ایک جگہ میں نرم نرم گھاس پر لیٹ کر گہری نیند سو گیا۔

ننھے سپاہی

میرا خیال ہے کہ میں نو گھنٹے سوتا رہا۔ سورج نکل رہا تھا کہ میری آنکھ کُھلی۔ میں چِت لیٹا ہوا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ کھڑا ہو جاؤں لیکن کھڑا نہ ہو سکا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے ہاتھ پاؤں ڈوریوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ میرے

© NCERT not to be republished

لمبے بالوں کو بھی ڈوریوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا کہ ڈوریاں بڑی باریک تھیں اور میرے جسم کے چاروں طرف ہزاروں کی تعداد میں لپٹی ہوئی تھیں اور مجھے اس طرح باندھا گیا تھا کہ میں ہِل تک نہیں سکتا تھا۔

میں چِت پڑا تھا۔ دھوپ سیدھی میری آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ پھر مجھے شور سا سنائی دیا، لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ اب ایسا لگا کہ میرے تمام بدن پر چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں۔ یہ میرے چہرے پر بھی آ گئی تھیں۔ میں نے غور سے دیکھنے کی کوشش کی تو وہ مجھے آدمی سے لگے، کُل پندرہ سینٹی میٹر لمبے۔ جو شخص مجھے نظر آ رہا تھا وہ سپاہی کی وردی پہنے ہوئے تھا۔ اس کے بعد اس طرح کے چالیس پچاس سپاہی اور آ گئے۔

میں تیروں کا نشانہ بن گیا

میں یہ سب دیکھتے دیکھتے اچانک خوشی سے چلاّ اُٹھا۔ وہ سب کے سب ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ (بعد میں مجھے یہ بتایا گیا کہ اس بھگدڑ میں کئی زخمی بھی ہو گئے تھے)۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر میرے بدن پر چڑھ دوڑے۔ ایک بونا

جو میرے چہرے کے قریب آ پہنچا، اس نے اپنے بازو اُٹھا کر زور سے کہا، ''ہکینا دوگُل۔'' دوسروں نے جواب دیا، ''ہکینا؟ دوگُل ہکینا۔'' میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ میں نے زور لگا کر ایک بازو زمین سے اُٹھا

ہی لیا۔ پھر سَر بھی اونچا کر لیا۔ اب معلوم ہوا کہ انھوں نے زمین میں کیلیں ٹھونک کر میرے بال ان سے باندھ دیے تھے۔ سَر میں سخت درد ہونے لگا۔ میں نے ان آدمیوں کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ سَر پٹ بھاگے۔ پھر شور وغُل سنائی دیا۔ شور کے ساتھ ایسا محسوس ہوا کہ میرے بازوؤں میں ہزاروں سوئیاں چُبھو دی گئی ہیں۔ دراصل وہ مجھ پر تیر چلا رہے تھے۔ کئی چھوٹے چھوٹے تیر میرے کپڑوں کے اندر گھُس گئے، مگر مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔ کچھ آدمی آسمان کی طرف تیر چلا رہے تھے جو میرے چہرے پر آ کر گر رہے تھے۔ ان سے میرے چہرے میں تکلیف ہونے لگی۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں کوئی تیر میری آنکھ میں نہ گھُس جائے۔ میں نے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

ننّھی مخلوق نے میز بنائی

پھر میں نے سوچا کہ خیر اسی میں ہے کہ میں رات تک چپکا پڑا رہوں اندھیرا ہونے پر ان ڈوریوں سے اپنے آپ کو چھڑاؤں گا۔ اتنی چھوٹی مخلوق سے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن آدمی سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ میں چُپ ہو رہا

تو تیر اندازی بھی رُک گئی، مگر اس مخلوق کی تعداد بے تحاشا بڑھ گئی۔ مجھے کان کے قریب کچھ آواز سنائی دی۔ دیکھا تو وہ لوگ لکڑی کی ایک میز بنا رہے تھے۔ وہ میز کُل پینتالیس سینٹی میٹر (تقریباً اٹھارہ انچ) اونچی تھی۔ اس پر چار ننھے آدمی کھڑے ہو سکتے تھے۔ جب میز تیار ہو گئی تو چار آدمی اس پر چڑھ آئے۔ ان میں سے ایک آدمی دوسرے کے مقابلے میں عمر میں زیادہ تھا۔ اس نے خوبصورت اور لمبا سا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کوٹ کو ایک لڑکے نے، جو اس کے پیچھے کھڑا تھا، زمین سے اُٹھا رکھا تھا۔ لمبے کوٹ والے نے کہا، ''لانگرو دَیہُل سان۔''

لمبے کوٹ والا آدمی

اس کی بات سن کر چالیس آدمی آگے بڑھے۔ انھوں نے میرے سر کے دوسری طرف ڈوریاں ڈالیں۔ اب میں اپنے سَر کو اِدھر اُدھر موڑ سکتا تھا اور ان لوگوں کو دیکھ سکتا تھا۔ پھر لمبے کوٹ والے آدمی نے بولنا شروع کیا۔ وہ بڑی روانی سے بول رہا تھا اور اس کے ساتھ وہ ہاتھ سے اشارہ بھی کرتا تھا۔ خاصی دیر تک وہ بولتا رہا۔ میں ان کی زبان تو نہیں سمجھتا تھا لیکن میرا اندازہ یہ تھا کہ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اگر تم ہمارے حکم کی تعمیل کروگے تو ہم تمھیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے اور اگر بھاگنے کی کوشش کی تو ہم تمھیں مار ڈالیں گے۔ میں نے اپنا ہاتھ اُٹھایا، آنکھیں آسمان کی طرف

کیں اور اس طرح اُن کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں تمھارا مطلب سمجھ گیا ہوں اور میں کوئی ایسی بات نہ کروں گا۔ پھر میں نے اُنھیں یہ بتانے کے لیے کہ میں بھوکا ہوں، اپنے منھ کی طرف اشارہ کیا۔

کھانے کا انتظام

لمبے کوٹ والا آدمی میرا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا اور تھوڑی دیر میں کوئی ایک سو آدمی میرے جسم پر مارچ کرتے ہوئے میرے منھ تک غذا لے کر آئے۔ یہ چیزیں بادشاہ نے بھجوائی تھیں، کیونکہ میری آمد کی اُسے اطلاع کر دی گئی تھی۔ غذا میں چڑیا کے سائز سے بڑی کوئی چیز نہیں تھی، لیکن لگتا یہ تھا کہ انھوں نے گائے بیل سالم پکوا کر بھیجے تھے۔ لوبیا دال کے دانے کے برابر مرغیاں بھی تھیں۔ میں دو تین چپاتیوں کا ایک لقمہ بناتا تھا اور وہ لوگ یہ دیکھ کر حیرت زدہ تھے۔ کھانا کھا چکنے کے بعد میں نے اشاروں سے پانی مانگا۔ وہ دودھ سے بھرا ہوا ایک برتن لائے اور میرے منھ میں اُنڈیل دیا۔ میں نے اور مانگا وہ دوسرا برتن لائے، لیکن اب ان کے پاس دودھ نہیں تھا۔ میرے کھانے پینے کو دیکھ کر وہ اتنے خوش ہوئے کہ انھوں نے میرے بدن پر رقص کی محفل منعقد کی اور اونچی آواز سے ''ہکینا دوگُل'' کے نعرے لگاتے رہے۔

جوناتھن سوئفٹ (مترجم احمد خاں خلیل)

سوالات

1. گُلی وَر کون تھا اور وہ کیا کرتا تھا؟
2. گُلی وَر کو سمندری جہاز میں کیا دقتیں پیش آئیں؟
3. خشک زمین پر گُلی وَر کو کون لوگ ملے اور اس نے کیا محسوس کیا؟
4. ننھے سپاہیوں نے گُلی وَر کے ساتھ کیا سلوک کیا؟
5. لمبے کوٹ والے آدمی کی تقریر کا گُلی وَر نے کیا مطلب سمجھا؟
6. گُلی وَر کے بدن پر ننھے سپاہیوں نے کیا کیا؟

© NCERT not to be republished

ہندوستان جنّتِ نشان

صالحہ عابد حسین

پیدائش : 1913 وفات : 1989

صالحہ عابد حسین کا اصل نام مصداق فاطمہ تھا۔ وہ پانی پت میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق حالی کے خاندان سے تھا۔ ان کی شادی ڈاکٹر عابد حسین سے ہوئی تھی، جو اپنے زمانے کے ممتاز دانشور تھے۔

صالحہ عابد حسین کے اہم ناول یادوں کے چراغ، قطرے سے گہر ہونے تک، اپنی اپنی صلیب، ساتواں آنگن اور راہِ عمل ہیں۔

انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کے کچھ مجموعوں کے نام اس طرح ہیں: نقشِ اوّل، سازِ ہستی، دردِ دماں، تین چہرے، نراس میں آس وغیرہ۔ صالحہ عابد حسین نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں اور مضامین لکھے ہیں، جیسے سنہرے بالوں والے، بچّوں کا دیس، بہار سندر، اور بچّوں کے الطاف حسین حالی وغیرہ۔ ان کی خودنوشت سوانح حیات کا نام سلسلۂ روز وشب ہے۔

صالحہ عابد حسین نے اپنی تخلیقات کا موضوع متوسط طبقے کے عام سماجی اور نفسیاتی مسائل کو بنایا ہے۔ ان کی زبان عام فہم اور سادہ ہے۔

اس مضمون میں صالحہ عابد حسین نے کشمیر، بھوپال، آگرہ اور حیدرآباد کے اپنے سفر کا بیان بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔

شادی کے بعد میں نے اپنے شوہر سے ایک ہی فرمائش کی تھی کہ مجھے سیاحت کا بہت شوق ہے۔ اور انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم دونوں انشاء اللہ ہندوستان دیکھیں گے بلکہ باہر کے ملکوں کی بھی سیاحت کریں گے۔ گزشتہ اڑتیس چالیس سال کے عرصے میں میں نے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جتنی سیاحت کی وہ میرے طبقے اور میری

حیثیت کی عورتوں کے نصیب میں بہت کم آتی ہے۔

میری صحت کی کمزوری کی وجہ سے عابد صاحب گرمی میں دِلّی سے باہر کسی پہاڑی مقام پر جانے کا پروگرام بنایا کرتے تھے۔ زمانہ سَستا تھا۔ کرائے کم تھے۔ پہاڑ پر ٹھہرنے کا انتظام کسی دوست کی وَساطت سے مفت یا بہت کم پیسوں میں ہو جاتا تھا۔ وہاں جا کر ہم دونوں لکھنے کا کام بھی کرتے تھے اور سیر بھی۔ اسی طرح میں نے ہندوستان کے پہاڑی مقامات دیکھے۔ شِملہ، نینی تال اور رانی کھیت کی بھی سیر کی۔ مہابلیشور تین دن جا کر رہے۔ یہ بڑا ہی سرسبز پُر فضا اور دل کش مقام ہے۔ لیکن سب سے زیادہ سیر میں نے کشمیر کی کی ہے۔ سری نگر اور آس پاس کے علاقے تو چھان ہی ڈالے۔ اس کے علاوہ پام پور، سون مرگ، یوس مرگ، مانس بن جھیل جس کے چاروں طرف کنول کے پھولوں کے تختے اُسے عجیب حُسن بخشتے ہیں۔ اچّھا بل، کُکر ناگ، اننت ناگ کے آب حیات کے سے چشمے دیکھے۔ ان کا ٹھنڈا میٹھا پانی پیا۔ اور ان کے حُسن سے آنکھوں کو تراوٹ بخشی۔ دائل کا جھولتا پل خود ایک عجیب چیز ہے اور پھر دریا کا حُسن اور اُس کے رنگ برنگے پتّھر جو جواہرات کو مات کرتے ہیں۔ اننت ناگ کی جھیل مقدس مانی جاتی ہے۔

جموں کے راستے سری نگر آتے جاتے کئی بار ویری ناگ جھیل کو دیکھا۔ حسبِ دستور مغلوں نے اس کے گرد بھی

ایک وسیع اور حسین باغ بنوا دیا تھا۔ اس جھیل کی گہرائی کی کوئی حد نہیں ہے۔ اسی سے دریائے جہلم نکلتا ہے۔ ہزاروں برس سے کروڑوں ٹن پانی اس میں بہتا رہتا ہے۔ اور دریائے جہلم میں کبھی پانی کی کمی نہیں ہوتی۔

یوں تو کشمیر کا چپہ چپہ جنتِ ارضی معلوم ہوتا ہے لیکن مجھے پہلگام سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس کی سیر سے جی کبھی نہیں بھرتا۔ پہاڑوں کی شان وشوکت و سرسبزی اور درختوں اور پھولوں کی شادابی، دریائے لدّر کا بے مثال حُسن، جس کے شفاف پانی نے اس چھوٹی سی وادی کو سچ مُچ وادیٔ مینو اساس بنا دیا ہے۔ پہلگام سے اوپر اونچی پہاڑیوں پر جایئے اور شاندار اور خوبصورت مناظر ملتے ہیں۔ آڑو اور چندن واڑی کی بلندیوں پر تو ہم سب گئے ہیں اور راستے میں تڑپتا ہوا چشموں کا سیماب اور بہتی ہوئی چاندنی کی سی آبشاریں، اونچی اونچی برف پوش چوٹیاں اور گہری سرسبز وادیاں ایک طرف نظروں کو اسیر کر لیتی ہیں تو دوسری طرف گھوڑوں کے پھسل جانے کے ڈر سے خوف بھی معلوم

ہوتا ہے۔ چندن واڑی پہنچ کر دور تک چشمے پر جمی ہوئی برف سڑک کے مانند دیکھی۔ اس پر چلے برف توڑ کر کھائی اور سردی سے جم جم سے گئے۔

گُل مَرگ کئی بار گئے۔ زمردیں پیالے کی سی نو ہزار فیٹ کی بلندی پر یہ وادی، حُسن و شادابی کا بڑا ہی دِلکش منظر پیش کرتی ہے۔ اس سے تین میل نیچے ٹنگ مرگ کی وادی ہے جس کا چشمہ دریا کے برابر چوڑا ہے اور ایسے ایسے رنگ اور منظر دکھاتا ہے کہ ''سبحان تیری قُدرت'' بے اختیار منہ سے نکلتا ہے۔ دریا، چشمے، سمندر، بہتا پانی میری کمزوری ہے۔ اس کا حُسن مجھے مسحُور کر دیتا ہے۔ گُل مَرگ سے تین میل پتلی پگڈنڈیوں پر پیدل یا ٹٹّو پر سوار ہو کر کھِلن مرگ جاتے ہیں۔ یہاں برف جمی ملتی ہے اور ایک طرف دوُر سری نگر کی وادی؛ اور دوسری طرف ہمالیہ کی سر بفلک برف کا تاج پہنے مشہور چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ یہاں کی ہوا ہلکی ہے میرا سانس رکتا محسوس ہوتا تھا مگر اس وقت ان باتوں کی پروا کِسے تھی۔

پہاڑوں کے علاوہ میدانی علاقوں کی سَیر بھی میں نے خوب خوب کی۔ دیہات اور گاؤں نِسبتاً کم دیکھے اور شہروں میں زیادہ گئی۔ پونا ایک بار تو چند دِن کی سیر کو گئی تھی۔ مغربی گھاٹ پر ننّھی پہاڑیوں پر بسا یہ شہر آس پاس کا

© NCERT not to be republished

سرسبز علاقہ دیکھنے کے قابل ہے۔ بمبئی تو بیسیوں بار گئی ہوں۔ شروع میں پورے بمبئی اور آس پاس کی سیریں خوب کیں مگر چند دن سے زیادہ وہاں جی نہ لگتا تھا۔ وہاں کا شور وغل میری برداشت سے باہر تھا۔ لیکن بمبئی کا سمندر گیٹ وے آف انڈیا، جوہو، چوپاٹی، میرین ڈرائیو، ہینگنگ گارڈن مجھے بہت پسند ہیں اور سمندر میں ڈوبتے اور طلوع ہوتے ہوئے سورج کا نظارہ، اور شام کی کرنوں سے چمکتے مچھیروں کی کشتیوں کے بادبان، میری نظروں کو باندھ لیتے تھے۔ جوہو پر سمندر کا جوار بھاٹا، تاڑ کے درختوں میں سے جھانکتا پورا چاند، اور سمندر پر جوار بھاٹے کا نظارہ، یہ سب میری دلچسپی کی چیزیں تھیں اور ہیں۔

بھوپال عابد صاحب کا وطن ثانی تھا۔ وہاں تین بار گئی اور صرف بھوپال ہی کی نہیں آس پاس کی سیر بھی کی۔ بھوپال سے واپسی پر آگرے کی سیر بھی کی، تاج کو دِن میں بھی دیکھا اور چاندنی رات میں بھی۔ پہلی بار تاج کو دیکھ کر جو اثر ہوتا ہے، جس طرح انسان مسحور ہو جاتا ہے، محبت اور عقیدت کا یہ شاہکار جس طرح دل میں بس جاتا ہے، اسے محسوس کیا جا سکتا ہے بیان نہیں۔ اس پر کندہ کلام پاک کی سورتیں پڑھی ہیں اور ان فن کاروں کو خراجِ عقیدت پیش کیا جنھوں نے یہ کمال دِکھایا ہے۔ تاج کی جالیوں کی نفاست اور باریکیوں پر سر دُھنا ہے۔ اس کے گنبد اور میناروں غرض ہر ہر چیز کو دیکھا ہے اور سوچا ہے کہ اِنسان کی حُسن کاری، نفاست اور محنت کا اس سے بڑھ کر شاہکار شاید کوئی اور نہیں ہوگا۔ یہ عمارت نہیں آرزو مجسم ہوگئی ہے۔

آگرے اور تاج کے ساتھ مجھے اجنتا اور ایلورا کی سیر یاد آ گئی۔ ہم نے اورنگ آباد کی تاریخی عمارتوں اور حیرت انگیز چیزوں کی سیر کی۔ بی بی کا روضہ، چھوٹا سا تاج محل کہا جا سکتا ہے۔ اجنتا کے آس پاس کا قدرتی منظر بہت ہی دِلکش ہے۔ میں نے یہ بات محسوس کی کہ ہمارے ہندوستانی رشیوں منیوں نے جہاں بھی عبادت گاہیں یا خانقاہیں بنوائیں تو سرسبز اور قدرتی حسن سے مالا مال علاقے چنے ہیں۔ دنیا کی سب لذّتیں ترک کر دیتے تھے۔ مگر حُسنِ قدرت سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیتیں ان میں غیر معمولی تھیں۔

حیدر آباد بھی ان مقامات میں سے ہے جن کو دیکھنے کی بچپن سے آرزو تھی۔ ایک گرمی میں ہم نے وہاں جانے کا پروگرام بنایا۔ حیدر آباد اور اس کے آس پاس کے سارے علاقے کی خوب سیر کی۔ اتنا ہی نہیں یہاں کے

ہر طبقے کی زندگی،تقریبات اور رہن سہن کو دیکھا۔ یہاں کے لوگوں کے خلوص اور ادب نوازی سے متاثر ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کئی بار جا کر دیکھی۔ اس کی قدیم مرکزی عمارت اتنی خوبصورت شاندار ونفیس ہے کہ بے اختیار منہ

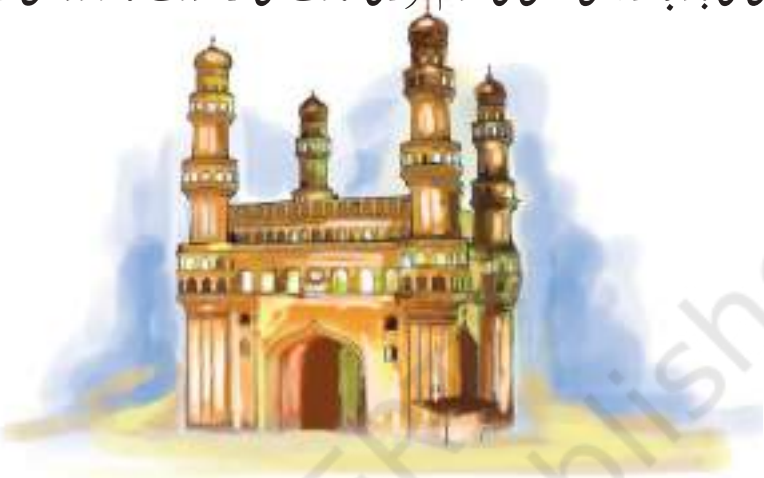

سے نکلا کہ علم کا یہ مندر حیدرآباد کی سب سے خوبصورت چیز ہے۔ حیدرآباد کے آس پاس کے سارے ساگر دیکھے۔ گولکنڈہ قلعہ کو خوب گھوم پھر کر دیکھا اور مرعوب ہوئی۔ سالار جنگ میوزیم کی دوبارہ زیارت کی مگر تشنگی باقی رہی۔ ایک شخص نے ہزاروں نوادرات، جن میں سے ہر ایک اپنے رنگ میں لاجواب ہے کس طرح جمع کر ڈالے، یہ خود ایک حیرت ناک چیز ہے۔ وہاں کی مساجد اور امام باڑے بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔ نوبت پہاڑ سے سارا شہر نظر آتا ہے۔

(صالحہ عابد حسین)

سوالات

1. شادی کے بعد مصنفہ نے اپنے شوہر سے کیا فرمائش کی؟
2. مصنّفہ نے کشمیر میں کن مقامات کی سیر کی؟
3. تاج محل کو دیکھ کر کیا محسوس کیا؟
4. مصنّفہ حیدرآباد کے کون کون سے مقامات سے متاثر ہوئیں؟
5. اپنے کسی سفر کا حال لکھیے۔

© NCERT not to be republished

سندباد جہازی کا دوسرا سفر

الف لیلہ

دنیا کے مختلف علاقوں میں داستانیں سننے سنانے کی روایت عام رہی ہے۔ ہندستان میں ''کتھا سرت ساگر'' پرانے قصوں کا معروف مجموعہ ہے۔ عرب دنیا میں الف لیلہ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ عربی میں یہ داستان الف لیلہ ولیلتہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے ''ایک ہزار اور ایک راتیں''۔ الف لیلہ ایک قصہ در قصہ داستان کا نام ہے جسے شہرزاد نامی ایک خاتون سے منسوب کیا جاتا ہے۔ روایت یہ ہے کہ شہرزاد کو قصّے کے طول دینے میں زبردست ملکہ حاصل تھا اور ہر رات وہ اپنے قصّے پر ایک ایسے موڑ پر لے جاکر چھوڑتی تھی جہاں سننے والے کا تجسّس بڑھ جاتا تھا۔ اگلی رات قصہ پھر آگے بڑھتا تھا اور پھر اس میں ایک نیا موڑ آ جاتا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ شہرزاد کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کی طرف سے اس کے زندہ رہنے کی شرط یہی تھی کہ داستان ختم نہ ہو۔ اس امتحان میں شہرزاد کھری اتری۔ اسی لیے دنیا بھر کے بیانیہ ادب میں شہرزاد کا نام اب بجائے خود ایک لیجنڈ بن چکا ہے۔ مغرب ومشرق کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں الف لیلہ کا ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ یہ داستان بچوں کی سب سے پسندیدہ کتابوں میں ہے۔

پہلے سفر کے بعد میں نے پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ اب کبھی سفر کا نام نہ لوں گا اور آرام سے بغداد میں زندگی گزاروں گا۔ کچھ مہینے اسی طرح گزر گئے۔ پھر میں آرام کی زندگی سے اُکتا گیا۔ میرا دِل مجھ سے بار بار کہتا کہ ''سفر کرو، سفر میں فائدے ہی فائدے ہیں۔ نئے نئے شہر دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر کسی شہر میں کوئی نایاب چیز مل گئی تو آدمی اسے دوسرے شہر میں بیچ کر لاکھوں کما سکتا ہے۔'' آخر میں نے سفر کا ارادہ کر ہی لیا اور ایک دن شہر سے اچھّی اچھّی چیزیں خرید کر جہاز پر سوار ہو گیا۔ میرے ساتھ دوسرے سوداگر بھی تھے۔

© NCERT not to be republished

ہم کئی دن تک سمندر میں سفر کرتے رہے۔ کبھی کسی بندرگاہ پر جہاز ٹھہر جاتا تو ہم اُتر جاتے۔ اپنے ساتھ لایا ہوا سامان مہنگے داموں بیچتے۔ اسی طرح وہاں اگر کوئی عجیب و غریب چیز مل جاتی تو اسے سستے داموں خریدتے اور دوسرے شہر میں اس کی بھاری قیمت وصول کرتے۔ اِس طرح مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس سفر میں بہت منافع ہوا۔

ایک دن ہمارا جہاز ایک جزیرے کے کنارے آ کر رکا۔ یہ جزیرہ بہت ہرا بھرا تھا۔ جگہ جگہ پھل دار درخت دکھائی دے رہے تھے۔ ہم سب اتر پڑے اور جزیرے کی سیر کرنے لگے۔ جزیرہ ویران پڑا تھا۔ وہاں کوئی آدم تھا نہ آدم زاد۔ لیکن درختوں میں طرح طرح کے پھل لگے ہوئے تھے۔ ہم سب مل کر درختوں سے پھل توڑ کر کھانے لگے۔ بڑا مزا آیا۔ پاس ہی ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ ہم سبھوں نے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیا اور اِدھر اُدھر سیر کو نکل گئے۔ جہاز کے کپتان نے اعلان کیا تھا کہ جہاز ایک گھنٹے کے بعد روانہ ہو جائے گا لیکن میں اپنی دُھن میں اکیلا بہت دور نکل گیا۔ ایک گھنے، سایہ دار درخت کو دیکھا تو اس کے نیچے تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گیا۔ لیکن بدقسمتی سے آنکھ لگ گئی۔

جب آنکھ کھلی تو آس پاس کسی ساتھی کو نہیں پایا۔ میں گھبرا کر جہاز کی طرف دوڑا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس طرح میں جزیرے پر اکیلا ہی رہ گیا۔ میں اپنے کیے پر بہت پچھتایا لیکن پچھتانے سے کیا ہوتا ہے؟ میں خود کو لعنت ملامت

کرنے لگا کہ میں نے دل کی بات کیوں مانی؟ کیا پہلے سفر کی مصیبتیں کم تھیں جو بیٹھے بٹھائے پھر آفت مول لی۔ میں حیران تھا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں؟ آس پاس پانی، آسمان اور ہرے بھرے درختوں کے سوائے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں جزیرے میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرنے لگا۔ میں دعا مانگتا تھا کہ ''یا خدا مجھے اس مصیبت سے بچا۔'' اچانک میری نظر ایک سفید چیز پر پڑی۔ میں اس کی طرف لپکا۔ نزدیک پہنچا تو مجھے وہ چیز ایک سفید گنبد کی طرح نظر آئی۔ سوچا کہ اس کے اندر جا کر دیکھنا چاہیے۔ چھوٗ نے پر گنبد کی دیوار بہت چکنی محسوس ہوئی۔ میں اس گنبد کے اِرد گرد گھومنے لگا کہ کہیں دروازہ نظر آ جائے۔ مگر یہ تو چاروں طرف سے بند تھا۔ اتنے میں یکا یک چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ میں سمجھا کہ شام ہو چلی ہے۔ سورج ڈوب گیا۔ آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو وہاں بادل کا ایک بڑا کالا ٹکڑا نظر آیا جو بڑی تیزی سے میری طرف چلا آ رہا تھا۔ میں سمجھا کہ اب زوردار بارش ہوگی لیکن بادل کا

وہ ٹکڑا تو میرے قریب آ کر نیچے اترنے لگا۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹکڑا گنبد پر اس طرح آ گرا کہ گنبد نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

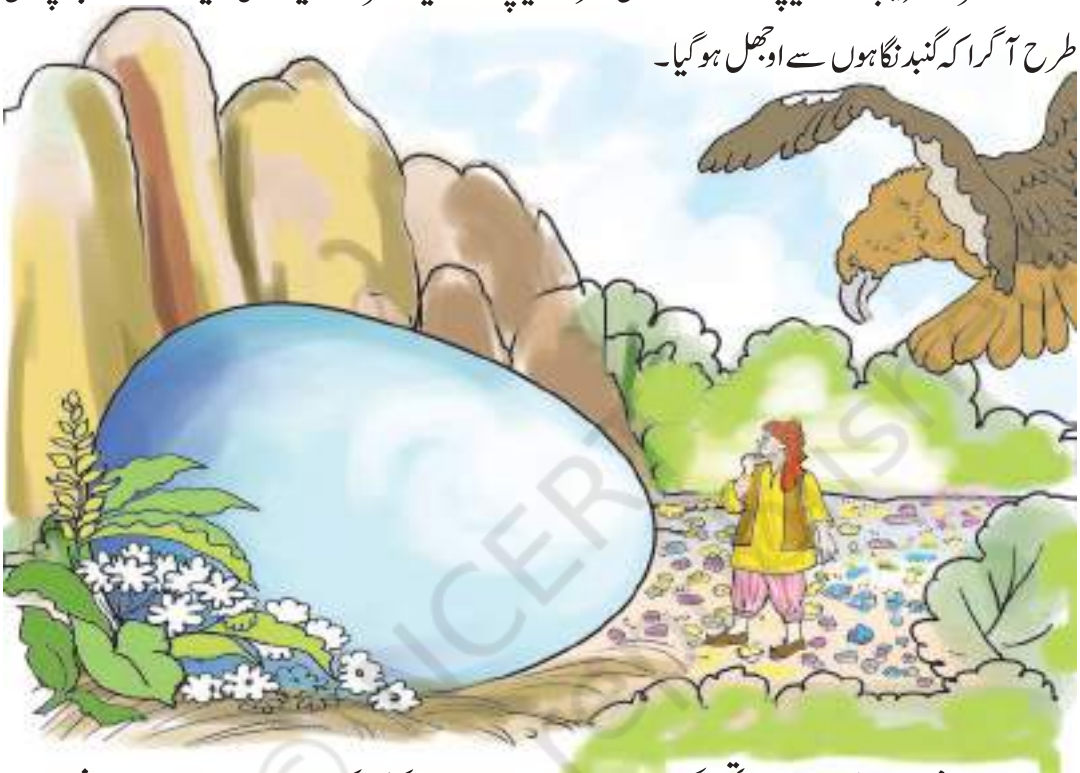

اچانک مجھے یاد آیا کہ میرے ساتھی اکثر ایک بہت بڑے پرندے کا ذکر کیا کرتے تھے جس کا نام ''سیمُرغ'' ہے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ یہ بادل کا ٹکڑا نہیں سیمُرغ ہے اور جسے میں سفید گنبد سمجھ رہا تھا وہ تو اس سیمُرغ کا انڈا ہے۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس جزیرے سے کیسے نکلا جائے۔ سوچتے سوچتے مجھے خیال آیا کہ میں اپنے آپ کو سیمُرغ کے پنجے سے باندھ لوں تو کل صبح سیمُرغ جہاں اڑ کر جائے گا میں بھی اس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ کہیں بھی۔ اس جگہ سے تو چھٹکارا ملے گا۔ آگے اللہ مالک ہے۔ میں سیمُرغ کا پنجہ تلاش کرنے لگا۔ مجھے اس کے پنجے کے بڑے بڑے ناخن نظر آئے۔ ہر ناخن درخت کی موٹی جڑ کی طرح تھا۔ میں نے پگڑی کھولی اور خود کو ایک ناخن کے ساتھ باندھ لیا اور رات بھر خدا سے دعا مانگتا رہا۔

صبح ہوئی۔ سیمُرغ اڑا۔ میں بھی اس کے ساتھ اُڑنے لگا۔ میں بہت گھبرا رہا تھا مگر کر بھی کیا سکتا تھا۔ اڑتے

اڑتے سیمُرغ نیچے اترنے لگا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ نیچے ایک وادی ہے۔ جیسے ہی وہ زمین کے قریب آیا میں نے پگڑی کا سِرا کھول دیا اور دھم سے زمین پر آ گرا۔ میں نے دیکھا کہ سیمُرغ ایک بڑے اژدہے کی طرف جھپٹا اور اژدہے کو اپنی چونچ میں دبا کر تیزی سے اُڑ گیا۔

اب میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یکا یک میری نظر زمین پر پڑی تو مجھے چاروں طرف ہیرے ہی ہیرے نظر آئے۔ اتنے بڑے اور اتنے سارے ہیرے میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ جھٹ سے میں نے ہیروں کو اٹھا اٹھا کر اپنی پگڑی میں جمع کرنا شروع کیا اور افسوس کرنے لگا کہ چمڑے کی تھیلی کیوں جہاز پر بھول آیا۔ اگر وہ ہوتی تو اور بھی ہیرے اکٹھا کر لیتا۔ اچانک مجھے اژدہے کی پھُنکار سنائی دی۔ مُڑ کر دیکھا تو کئی اژدہے اپنے اپنے بِلوں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اتنے سارے

یہ کہنا ہی تھا کہ اوپر سے ایک گوشت کا ٹکڑا میرے پاس آ کر گرا۔ اس کے بعد تو پھر گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے وادی میں گرنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ ان ٹکڑوں سے ہیرے لپٹ جاتے تھے۔ یہ دیکھتے ہی مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ کسی جزیرے کی ایک وادی میں ہیرے کی کان ہے۔ سوداگر اس وادی میں

گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے پھینکتے ہیں۔ ان سے ہیرے چپک جاتے ہیں۔ بڑے بڑے گدھ وادی میں آ کر ان ٹکڑوں کو اپنے پنجوں سے اٹھا کر اُڑ جاتے ہیں اور انھیں اپنے گھونسلوں میں لا کر خود کھاتے ہیں اور اپنے بچّوں کو بھی کھلاتے ہیں۔ اس سے پہلے سوداگر گدھ کو اڑا کر گوشت سے چپکے ہوئے ہیرے نکال لے جاتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہی وہ ہیرے کی کان ہے۔ میں نے ہیروں سے بھری پگڑی اپنی کمر سے کس کر باندھ لی اور گوشت کے ایک بڑے ٹکڑے کو پگڑی کے ایک سرے سے اپنی پیٹھ پر باندھ لیا اور زمین پر اوندھا لیٹ گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وادی میں گدھ ایک ایک کر کے اترنے لگے۔ ایک بہت بڑا گدھ اس گوشت کے ٹکڑے کی طرف جھپٹا جو میری پیٹھ پر بندھا ہوا تھا۔ وہ اسے اپنے پنجوں سے لے کر اڑا۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ اڑنے

لگا۔ جب گدھ اپنے گھونسلے میں پہنچا تو جھٹ سے میں نے اپنے آپ کو گوشت کے ٹکڑے سے الگ کر لیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اتنے میں وہاں ایک سوداگر آیا اور ڈنڈا دکھا کر گدھ کو اڑا دیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو حیران ہوا۔ سمجھا کہ میں کوئی چور ہوں اور ہیرے چرانے آیا ہوں۔ میں نے اسے سارا ماجرا کہہ سنایا اور کہا کہ ''گوشت سے لپٹے ہوئے ہیرے تمھارے ہیں۔ میں اور بھی ہیرے سمیٹ کر لایا ہوں۔'' پھر میں نے پگڑی میں بندھے ہوئے ہیرے اسے دکھائے اور کہا'' جتنے چاہو لے لو مگر پہلے مجھے پانی پلاؤ، کھانا کھلاؤ ورنہ میں مر جاؤں گا۔''

یہ سن کر سوداگر بہت خوش ہوا اور مجھے اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔ میری خوب خاطر تواضع کی اور میرے پاس سے ایک بھی ہیرا نہیں لیا۔ پھر اس نے میرے بغداد جانے کا انتظام کر دیا۔ اس سوداگر کی مہربانی سے میں جہاز پر سوار ہوا اور اس طرح میں اپنے سفر سے مالا مال ہو کر لوٹا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

(الف لیلہ سے ماخوذ)

سوالات

1. سندباد جہازی نے دوسرا سفر کیوں شروع کیا؟
2. جزیرے کی سیر کرتے ہوئے سندباد نے کیا کیا دیکھا؟
3. جزیرے میں گوشت کے ٹکڑے گرنے پر سندباد کو کیا یاد آیا؟
4. جزیرے سے سندباد جہازی کس ترکیب سے نکلا تھا؟
5. سوداگر نے سندباد کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

© NCERT not to be republished

مجھے میرے بزرگوں سے بچاؤ

کنہیالال کپور

پیدائش : 1910 وفات : 1980

کنہیالال کپور چک ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد، پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ہری کپور تھا۔ طنز و مزاح کے میدان میں کنہیالال کپور اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کے اہم مضامین 'اخبار بینی'، 'چینی شاعری'، 'غالب ترقی پسند شعرا کی محفل میں' وغیرہ ہیں۔ ان کی کتابوں کے نام سنگ و خشت، شیشہ و تیشہ، جنگ و رباب، نوکِ نشتر، بال و پر، نرم گرم اور گرد کارواں میں کنہیالال کپور کی زبان عام فہم ہے۔ ان کا طنز و مزاح قاری کو زیرِ لب ہنساتا ہے۔ وہ اپنے طنز و مزاح سے کسی فرد کی دل شکنی نہیں کرتے، بات میں بات پیدا کر کے قاری کو ہنساتے ہیں۔ کبھی کبھی حقائق کو الٹ پھیر کر بھی مزاح پیدا کر دیتے ہیں۔

میں ایک چھوٹا سا لڑکا ہوں ایک بہت بڑے گھر میں رہتا ہوں۔ زندگی کے دن کاٹتا ہوں، چوں کہ سب سے چھوٹا ہوں اس لیے گھر میں سب میرے بزرگ کہلاتے ہیں۔ یہ سب مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ انھیں چاہے اپنی صحت کا خیال رہے نہ رہے میری صحت کا خیال ضرور رستا تا ہے۔ دادا جی کو ہی لیجیے۔ یہ مجھے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتے کیوں کہ باہر گرمی یا برف پڑ رہی ہے۔ بارش ہو رہی ہے یا درختوں کے پتے جھڑ رہے ہیں۔ کیا معلوم کوئی پتّا میرے سر پر تڑاخ سے لگے اور میری کھوپڑی پھوٹ جائے۔ ان کے خیال میں گھر اچھا خاصا قید خانہ ہونا چاہیے۔ ان کا بس چلے تو ہر ایک گھر کو جس میں بچے رہتے ہیں سینٹرل جیل میں تبدیل کر کے رکھ دیں۔ وہ فرماتے ہیں بچوں کو بزرگوں کی خدمت کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت مجھ سے چلم بھرواتے یا پاؤں دبواتے رہتے ہیں۔

دادی جی بہت اچھی ہیں۔ پوپلا منہ چہرے پر بے شمار جھُریاں اور خیالات بے حد پرانے۔ ہر وقت مجھے

بھُوتوں، جنوں اور چُڑیلوں کی باتیں سُنا سُنا کر ڈراتی رہتی ہیں: ''دیکھو بیٹا مندر کے پاس جو پیپل ہے، اس کے نیچے مت کھیلنا۔ اس کے اوپر ایک بھوت رہتا ہے۔ آج سے پچاس سال پہلے جب میری شادی نہیں ہوئی تھی میں اپنی ایک سہیلی کے ساتھ اس پیپل کے نیچے کھیل رہی تھی کہ یک لخت میری سہیلی بے ہوش ہوگئی۔ اس طرح وہ سات دفعہ ہوش میں آئی اور سات دفعہ بے ہوش ہوگئی۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے چیخ کر کہا ''بھوت'' اور وہ پھر بے ہوش ہوگئی۔

اسے گھر پہنچایا گیا جہاں وہ سات دن کے بعد مرگئی۔ اور ہاں پرانی سرائے کے پاس جو کنواں ہے اس کے نزدیک مت پھٹکنا۔ اس میں ایک چُڑیل رہتی ہے۔ وہ بچوں کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہے۔ اس چُڑیل کی یہی خوراک ہے۔''

پتا جی کا تکیہ کلام ہے ''نالائق۔'' ایک اور تکیہ کلام ہے ''جب میں طالبِ علم تھا۔'' وہ جب بھی مجھ سے گفتگو کرتے ہیں ان دونوں میں سے ایک تکیہ کلام ضرور استعمال کرتے ہیں۔

''آج کتنے سوال نکالے؟''

''جی دس۔''

''صرف دس۔ نالائق۔''

''آج تاریخ کے کتنے صفحے پڑھے؟''

''جی بیس۔''

''نالائق! جب میں طالبِ علم تھا پچاس صفحے روز پڑھا کرتا تھا۔''

''اکبر کون تھا؟''

''جی ایک بادشاہ تھا۔''

''نالائق! کہو ایک بہت اچھّا بادشاہ تھا۔''

''امتحان کیسے رہے؟''

''جی جماعت میں تیسرا رہا ہوں۔''

''نالائق! جب میں طالبِ علم تھا ہمیشہ اوّل آیا کرتا تھا۔''

''آج کتنی روٹیاں کھائیں؟''

''جی تین۔''

''نالائق! جب میں طالبِ علم تھا دس روٹیاں کھایا کرتا تھا۔''

© NCERT not to be republished

ماتا جی کو ہر وقت یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ پرماتما نہ کرے اگر مجھے کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا؟ وہ مجھے تالاب میں تیرنے کے لیے اس لیے نہیں جانے دیتیں کہ اگر میں ڈوب گیا تو؟ آتش بازی کے اناروں، پٹاخوں اور پھلجھڑیوں سے اس لیے نہیں کھیلنے دیتیں کہ اگر میرے کپڑوں میں آگ لگ گئی تو؟ خالی پستول ہاتھ میں نہیں لینے دیتیں کہ اگر یہ چل گیا تو؟ پچھلے دنوں میں کرکٹ کھیلنا چاہتا تھا۔ ماتا جی کو پتہ لگ گیا۔ کہنے لگیں کرکٹ مت کھیلنا۔ بڑا خطرناک کھیل ہے۔ پرماتما نہ کرے اگر گیند آنکھ پر لگ گئی تو؟

بڑے بھائی صاحب کا خیال ہے جو چیز بڑوں کے لیے بے ضرر ہے چھوٹوں کے لیے سخت مضر ہے۔ خود چوبیس گھنٹے پان کھاتے ہیں لیکن اگر مجھے کبھی پان کھاتا دیکھ لیں تو فوراً ناک بھوں چڑھائیں گے۔ پان نہیں کھانا چاہیے۔ بہت گندی عادت ہے۔ سنیما دیکھنے کے بہت شوقین ہیں، لیکن اگر میں اصرار کروں تو کہیں گے چھوٹوں کو فلمیں نہیں دیکھنا چاہیے۔ اخلاق پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

اسی طرح چھوٹوں کو عطر نہیں لگانا چاہیے تاکہ ان کے کپڑوں سے خوشبو نہ آئے۔ نظمیں نہیں لکھنا چاہئیں تاکہ وہ بڑے ہو کر شاعر نہ بن جائیں۔ ہنسنا نہیں چاہیے تاکہ وہ ہمیشہ اُداس رہیں۔

اب رہیں بھابی، انھیں افسانہ لکھنے اور جاسوسی ناول پڑھنے کا شوق ہے۔ ان کا تکیہ کلام ہے لپک کے جائیو۔ جب بھی میں کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹتا ہوں وہ کہتی ہیں۔ ''لپک کے جائیو'' اور دل پسند بک اسٹال سے رسالہ ''سورج مکھی'' کا تازہ نمبر لے آئیو۔ اگر سورج مُکھی نہ ملے تو ''چندر مُکھی'' لے آنا۔ اگر وہ بھی نہ آیا ہو تو ''تارا مکھی'' اور ہاں پوچھتے آنا ''چالاک چور'' کا دوسرا حصّہ چھپ گیا کہ نہیں اور ''پُھرتیلا ڈاکو'' کب تک چھپ رہا ہے۔'' سارا دن ایک بک اسٹال سے دوسرے بک اسٹال تک مارا مارا پھرتا ہوں کبھی ''نقاب پوش'' حصہ اوّل کی تلاش میں اور کبھی ''پُراَسرار قلعہ'' حصہ دوم کی کھوج میں۔

بڑی بہن کو گانے بجانے کا شوق ہے۔ ان کی فرمائشیں اس قسم کی ہوتی ہیں ''ہارمونیم پھر خراب ہو گیا ہے۔ اسے ٹھیک کرا لاؤ۔ ستار کے دو تار ٹوٹ گئے ہیں اسے میوزیکل ہاؤس لے جاؤ۔ طبلہ بڑی خوفناک آوازیں نکالنے لگا

ہے اسے فلاں دُکان پر چھوڑ آؤ۔ جب انھیں کوئی کام لینا ہو تو بڑی میٹھی بن جاتی ہیں۔ کام نہ ہو تو کاٹنے کو دوڑتی ہیں اور وہ طرح طرح کی فضول باتیں بناتی ہیں اس وقت میں انھیں زہر لگنے لگتا ہوں۔

لے دے کے سارے گھر میں ایک غم گُسار ہے اور وہ ہے میرا کُتّا ''موتی'' بڑا شریف جانور ہے۔ وہ نہ تو بھوتوں اور چڑیلوں کے قصّے سنا کر مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کرتا نہ مجھے نالائق کہہ کر میری حوصلہ شکنی کرتا ہے اور نہ اسے جاسوسی ناول پڑھنے کا شوق ہے اور نہ ستار بجانے کا۔ بس ذرا موج میں آئے تو تھوڑا سا بھونک لیتا ہے۔ جب اپنے بزرگوں سے تنگ آجاتا ہوں تو اسے لے کر جنگل میں نکل جاتا ہوں۔ وہاں ہم دونوں تیتریوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ دادا جی اور دادی جی سے دور۔ پتا جی اور ماتا جی سے دور۔ بھابی اور بہن کی دسترس سے دور اور کبھی کبھی کسی درخت کی چھاؤں میں۔ موتی کے ساتھ سستاتے ہوئے میں سوچنے لگتا ہوں کاش! میرے بزرگ سمجھ سکتے کہ میں بھی انسان ہوں یا کاش وہ اتنی جلدی نہ بھول جاتے کہ وہ کبھی میری طرح بچّے تھے۔

(کنہیالال کپور)

سوالات

1. بزرگوں کی زیادہ نصیحتوں سے بچّوں کو کیا نقصان ہوتا ہے؟
2. مصنّف کی دادی اُسے کہاں کہاں جانے سے منع کرتی تھیں؟
3. مصنّف کے پتا جی کا کیا تکیہ کلام تھا؟
4. مصنّف کے بڑے بھائی کا چھوٹے بچّوں کے بارے میں کیا خیال تھا؟
5. مصنّف کی بھابھی اور بہن کے کیا کیا شوق ہیں؟
6. مصنّف کی بھابی کون کون سے ناول منگواتی تھیں؟

© NCERT not to be republished

چند مناظرِ قدرت

ابنِ انشا

اصل نام : شیر محمد خاں قلمی نام : ابن انشا وطن : جالندھر

پیدائش : 1927 وفات : 1979

ابنِ انشا کا شمار جدید دور کے سب سے ممتاز مزاح نگاروں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری پر ہندی روایت اور گیتوں کی زبان کا گہرا اثر ہے اور وہ اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''چاند نگر'' کو سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح ان کی نثر کا ذائقہ بھی دوسرے مزاح نگاروں سے الگ ہے۔ مزاح پیدا کرنے کے لیے وہ لطیفوں کا سہارا نہیں لیتے۔ ان کے بیان میں فطری بے ساختگی کا عنصر نمایاں ہے۔ اسلوب سیدھا سادا ہے۔ لیکن اپنی طباعی اور ذہانت سے وہ عام واقعات کے بیان میں بھی ہنسی اور لطف کا پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ابنِ انشا اپنے سفرناموں کے لیے خاص طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں ''چلتے ہو تو چین کو چلیے''، ''دنیا گول ہے۔''، ''آوارہ گرد کی ڈائری''، ابن بطوطہ کے تعاقب میں'' اور ''نگری نگری پھرا مسافر'' بہت مشہور ہیں۔ ان کی دوسری کتابوں میں ''اردو کی آخری کتاب'' کو بہت شہرت ملی۔ ''چند مناظرِ قدرت'' اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔ ان کی کئی کتابوں کے ترجمے ہندی اور دیگر زبانوں میں بھی شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

آسمان

ذرا نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھو۔ کتنا اونچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی اس سے گرے تو بہت چوٹ آتی ہے۔ بعض لوگ آسمان سے گرتے ہیں تو کھجور میں اٹک جاتے ہیں۔ نہ نیچے اُتر سکتے ہیں، نہ دوبارہ آسمان پر چڑھ

© NCERT not to be republished

سکتے ہیں۔ وہیں بیٹھے کھجوریں کھاتے رہتے ہیں۔ لیکن کھجوریں تو کہیں کہیں ہوتی ہیں، ہر جگہ نہیں ہوتیں۔

کہتے ہیں پہلے زمانے میں آسمان اتنا اونچا نہیں ہوتا تھا۔ غالبؔ نام کا شاعر، جو سو سال پہلے ہُوا ہے، ایک جگہ کسی سے کہتا ہے:

کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟

جوں جوں چیزوں کی قیمتیں اونچی ہوتی گئیں، آسمان ان سے باتیں کرنے کے لیے اوپر اٹھتا چلا گیا۔ اب نہ چیزوں کی قیمتیں نیچے آئیں نہ آسمان نیچے اُترا۔

ایک زمانے میں آسمان پر صرف فرشتے رہا کرتے تھے۔ پھر ہَما شُما جانے لگے۔ جو خود نہ جا سکتے تھے ان کا دماغ چلا جاتا تھا۔ یہ نیچے زمین پر دماغ کے بغیر ہی کام چلاتے تھے۔ بڑی حد تک اب بھی یہی صورت ہے۔

پیارے بڑو! راہ چلتے میں آسمان کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے تاکہ ٹھوکر نہ لگے۔ جو زمین کی طرف دیکھ کر چلتا ہے اس کے ٹھوکر نہیں لگتی۔

ستارے اور ہلال وغیرہ

واہ واہ! کیا سُہانا منظر ہے۔ ستارے یہاں سے وہاں تک چھٹکے ہوئے ہیں۔ ان کی کثرت سے گمان ہوتا ہے جیسے میٹرک کا ریزلٹ شائع ہوا ہو۔ ادھر ایک ہلال بھی جگمگا رہا ہے۔ آسمان کی رونق بڑھا رہا ہے۔

© NCERT not to be republished

ستارے چمکتے دمکتے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ٹوٹ کر گر بھی جاتے ہیں۔ جب یہ مِٹّی میں مل جائیں تو کوئی نہیں پوچھتا۔

ہلال یعنی نئے چاند کو پُرانے لوگ دؤر ہی سے دیکھا کرتے تھے اور سلام کیا کرتے تھے، وہ بھی عید، بقرعید

پر۔ اُس زمانے میں یہ چپ چاپ آپ ہی آپ نکل آتا تھا۔ پھر ایسا دور آیا، کہ لوگوں نے کھدیڑ کر نکالنا شروع کر دیا، بلکہ آپس میں لڑتے تھے کہ کون نکالے۔ چاند کے لیے بڑی مشکل ہوتی تھی کہ سرکار کا کہا مانے یا لوگوں کا۔ بے شک اتنی بڑی قوم کے لیے ایک دن کی عید کافی نہیں۔ یکے بعد دیگرے دو تین دن کی تو ہو۔ لیکن اس میں سر پھُٹّول بہت تھی۔ اب یہ سلسلہ بند ہے، اور یہ بات ہمیں پسند ہے۔

عید کا پیغام لانے کے علاوہ چاند کا کوئی خاص مصرف نہ تھا۔ بس شاعر اور چکور وغیرہ اس سے بات کر لیتے تھے۔ یا پھر ان بستیوں میں جہاں بجلی نہیں، یہ لالٹین کا کام دیتا تھا۔ کچھ عرصہ ہُوا ولایت والوں کو اس کے پیلے رنگ

سے خیال ہوا کہ یہ سونے کا بنا ہوا ہے۔ آخر اُڑ کر جا پہنچے اور کالی کالی مِٹّی کی بوریاں بھر لائے۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ایسی مِٹّی، بلکہ اس سے اچھّی مٹی تو یہاں بھی ڈھیروں ہے۔ بہت پچھتائے۔

ہوا

یہ ہوا— تحقیق نہیں ہو سکا کہ اتنی ہوا کہاں سے آ گئی کہ ایک الگ محکمہ آب و ہوا کا بنانا پڑا۔ ہوا عجیب چیز ہے۔ یہ آگ کو جلاتی ہے۔ چراغ کو بجھاتی ہے۔ جہاز اسی سے چلتے ہیں، اسی سے ڈوبتے ہیں۔

لوگوں کی زندگی کا مدار ہوا پر ہے۔ ہوا نہ ملے تو لوگ مر جاتے ہیں۔ ویسے کھانا نہ ملنے سے بھی مر جاتے ہیں۔ لیکن ہوا نہ ملنے سے جلدی مر جاتے ہیں۔ اسی لیے تو کوئی غریب آدمی کسی بڑے آدمی کے پاس کوئی سوال لے کر جاتا ہے تو یہ جواب پاتا ہے کہ ”جاؤ ہوا کھاؤ۔“

© NCERT not to be republished

بڑے لوگ یہ مشورہ نہ دیتے تو بہت سے غریب کچھ اور کھا کر اب تک مر گئے ہوتے۔

ہوا کے نقصانات بھی ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ بہت اونچا اُڑا کر لے جاتی ہے اور پھر پٹخ دیتی ہے۔ بعض کے پیٹ میں بھر جاتی ہے بعض کے سر میں۔ دونوں صورتوں میں تکلیف ہوتی ہے۔ اس شخص کو بھی، اور دوسروں کو بھی۔

ہوا میں وزن بھی ہوتا ہے لیکن بہت کم۔ پرانے لوگ جو اس کی کمند میں پھنس جاتے تھے، فارسی میں خدا سے دُعا کیا کرتے تھے— کہ کریما! ہمارے حال پر بخشش کر۔ اب لوگ نہ فارسی پڑھیں، نہ یہ دُعا کریں، نہ ان کی بخشِش ہو۔

پہاڑ

اِن پہاڑوں کو دیکھو۔ بعضوں کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ کیا باتیں کرتی ہیں؟ یہ کسی نے نہیں سُنا۔ پہاڑوں کے اندر کیا ہوتا ہے؟ معلوم نہیں۔ بعض اوقات پہاڑ کو کھودو، تو اندر سے چوہا نکلتا ہے۔ بعض اوقات چوہا بھی نہیں نکلتا۔ جس پہاڑ سے چوہا نکلے اسے غنیمت جاننا چاہیے۔

جو لوگ پہاڑوں پر رہتے ہیں ان کو گرم کپڑے تو ضرور بنوانے پڑتے ہیں لیکن ویسے کئی فائدے بھی ہیں۔ پہاڑوں پر برف جمتی ہے جو ان لوگوں کو مفت مل جاتی ہے۔ جتنا جی چاہے پانی میں ڈال کر پئیں۔ برف میں رہنے والوں کو ریفریجریٹر بھی نہیں خریدنے پڑتے۔ پیسے بچتے ہیں۔

جو پہاڑ بہت سر بلندی دکھاتے ہیں، ان کو کاٹتے ہیں اور کاٹ کر ان کے پتّھر سڑکوں پر بچھاتے ہیں۔ لوگ انھیں جوتوں سے پامال کرتے گزرتے ہیں۔ جو پتّھر زیادہ ہی سختی دکھائیں وہ چکّی میں پستے ہیں۔ سُرمہ بن جاتے ہیں۔ سارا پتھر پن بھوُل جاتے ہیں۔

ابر

یہ ابر ہے۔ اب سائنس کا زمانہ ہے۔ کوئی بچّہ بھی بتا دے گا کہ ابر کیا ہوتا ہے۔ مرزا غالبؔ اتنے بڑے شاعر ہو کر لوگوں سے پوچھتے پھِرا کرتے تھے کہ

ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟
ہماری ناقِص رائے میں مرزا غالبؔ نے سو سال پہلے پیدا ہو کر غلطی کی۔

بعض اوقات لوگ ابر کو بلوانے کے لیے دعائیں کرتے ہیں، بعض اوقات اِسے بند کرانے کے لیے۔ کبھی کبھی دھوکا بھی دے جاتا ہے۔ ابر — جس کی ایک قِسم کو ابرِ رحمت بھی کہتے ہیں، اپنی مرضی کا مالک ہے۔ جس کھیتی پر چاہتا ہے، برس جاتا ہے۔ بے ضرورت بھی برس جاتا ہے۔ جہاں ضرورت ہو وہاں لوگ ترستے رہ جاتے ہیں۔ ایک ہی جگہ بار بار برس کر جل تھل کر دینا ٹھیک نہیں۔ لیکن ابر کو یہ بات کون سمجھائے؟

اے ابر! تو جم جم کر برس۔ تجھے برسنے سے ہم نہیں روکتے۔ لیکن یہ کیا کرتا ہے! بھرے ہوؤں کو بھرتا ہے۔ ہوش میں آ! کچھ چھینٹے ہمارے کھیتوں میں بھی ڈال جا۔

(ابنِ انشا)

سوالات

1. ''آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا'' سے کیا مراد ہے؟
2. ''ستاروں کی کثرت سے گمان ہوتا ہے جیسے میٹرک کا ریزلٹ شائع ہوا ہو''— ستاروں کی کثرت اور میٹرک کے ریزلٹ میں کیا بات یکساں ہے؟
3. مصنّف نے اپنے خاص مزاحیہ انداز میں چاند کے کیا مصرف بتائے ہیں؟
4. اپنی اونچائی پر اترانے والے پہاڑوں اور انسانوں کا کیا انجام ہوتا ہے؟
5. ابنِ انشا نے ہوا کو عجیب چیز کیوں کہا ہے؟
6. ابر کو اپنی مرضی کا مالک کیوں کہا گیا ہے؟

© NCERT not to be republished

اردو کا ایک انوکھا ادیب ابنِ صفی

اردو زبان و ادب کو عام لوگوں تک پہنچانے والوں میں ابنِ صفی کی خدمات بے مثال ہیں۔ وہ اپنے جاسوسی ناولوں کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ ان کی مقبولیت اس طرح بڑھی کہ اچھے اچھوں کو انھوں نے پیچھے چھوڑ دیا۔

ایسے بہت سے لوگ، جو یہ سمجھتے تھے کہ ادب صرف ادب کا اعلیٰ ذوق رکھنے والوں یا ایک خاص سطح کی معاشرتی زندگی گذارنے والوں کی جاگیر ہے، اِبنِ صفی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اِبنِ صفی کی کتابیں ہر طبقے کے اردو پڑھنے والوں میں پسند کی گئیں۔ ان میں اعلیٰ ادنیٰ کی تمیز نہ تھی۔ بہتوں نے تو صرف ابنِ صفی کے ناول پڑھنے کی خاطر اردو سیکھی۔ اِبنِ صفی کے ناولوں کا ترجمہ ہندستان کی کئی زبانوں میں کیا گیا ہے۔ ان ناولوں کو خریدنے کے لیے کبھی کبھی گاہکوں کی قطار لگ جاتی تھی۔ بہت سے لوگ اپنی سنجیدگی کا بھرم رکھنے کے لیے اِبنِ صفی کے ناولوں کو چھُپ چھُپ کر پڑھتے تھے۔

اِبنِ صفی کے ناول اتر پردیش کے شہر الہ آباد کے ایک اشاعتی ادارے نکہت پبلی کیشنز نے شائع کیے۔ اس ادارے نے ''جاسوسی دنیا'' کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا تھا۔ ہر مہینہ اِبنِ صفی کا ایک مکمل ناول ''جاسوسی دنیا'' کے ایک شمارے کے طور پر سامنے آتا تھا۔ لوگ بے چینی سے اس کے منتظر رہتے تھے۔ اِبنِ صفی کے ناولوں میں کرنل فریدی، کیپٹن حمید، عمران، قاسم وغیرہ مستقل کرداروں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کرداروں میں ایسی کشش تھی کہ کچھ

لوگ تو انھیں حقیقی سمجھنے لگے تھے اور ان کی ہر کامیابی کا جشن مناتے تھے۔ان کی خوشی سے خوش ہوتے تھے اور ان کی آزمائش اور تکلیف پر دکھی ہو جاتے تھے۔اِبنِ صفی نے اپنے بعض کردار اور ناولوں کے پلاٹ مغربی ناولوں سے اخذ کیے تھے۔لیکن انھیں مشرقی یا ہندوستانی رنگ ڈھنگ کے ساتھ کچھ اس طرح پیش کیا تھا کہ یہ کردار طبع زاد نظر آتے تھے۔

اردو میں جاسوسی ادب کی روایت زیادہ مستحکم نہیں تھی۔ ابنِ صفی سے پہلے اس میدان میں ظفر عمر اور تیرتھ رام فیروز پوری وغیرہ نے شہرت پائی تھی۔لیکن ابنِ صفی کی طبّاعی، قوتِ ایجاد، تخیّل اور نکتہ رسی کا کوئی جواب نہیں۔ابنِ صفی کو زبان و بیان پر بھی غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ بہت رواں دواں شگفتہ اسلوب تھا۔ان کی حسِ مزاح بھی بہت شدید تھی۔مکالمہ نگاری، کردار نگاری، واقعہ نگاری اور منظر نگاری کی صلاحیت بھی بہت تھی۔ابنِ صفی نے عوامی ادب کو خواص کے مطالعے کا حصہ بنا دیا۔انھوں نے تقریباً ڈھائی سو ناول لکھے جن میں 'دلیر مجرم'، 'سائے کی لاش'، 'شیطانی جھیل'، 'خون کا دریا'، 'ڈیڑھ متوالے'، 'عجیب آوازیں'، 'لڑکیوں کا جزیرہ'، 'خوفناک جنگل'، 'پیاسا سمندر'، 'مصنوی ناک' اور 'قاصد کی تلاش' مشہور ہیں۔

اِبنِ صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا۔ وہ اتر پردیش کے ضلع الہ آباد کے ایک قصبے نارہ کے رہنے والے تھے۔ 26/اپریل 1928 کو ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے طالب علم رہے۔ سنجیدہ شاعری کی۔ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین لکھے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کے جاسوسی ناول ہیں۔

اِبنِ صفی کے ناولوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کے ہر ناول کا قصہ ان کی گہری انسان دوستی کے گرد گھومتا ہے۔ انھیں جرائم سے، بدعنوانیوں سے، بے ایمانی اور قوم فروشی سے نفرت تھی۔ وہ اعلیٰ معاشرتی قدروں کے ترجمان تھے۔ اسی لیے ان کا ہیرو سماج کو نقصان پہنچانے والی طاقتوں پر ہمیشہ غالب آتا ہے، اور جرائم کا پردہ فاش کرتا ہے۔

ابنِ صفی رواروی میں بھی گہری باتیں کہہ جاتے تھے۔ اسی لیے ان کی کوئی بھی تحریر کبھی بوجھل نہیں ہوتی۔ بڑے اور چھوٹے، عوام اور خواص سب ہی نے ان کے ہنر کی داد دی ہے۔

افسوس کہ ابنِ صفی کی زندگی کا چراغ صرف باون برس کی عمر میں بجھ گیا۔ ان کا انتقال 26/جولائی 1980 کو کراچی میں ہوا۔ جاسوسی ادب کی تاریخ میں ان کا ثانی ابھی تک کوئی نہیں۔ ان سے پہلے بھی اس میدان میں ان کے مرتبے کا لکھنے والا پیدا نہیں ہوا تھا۔

(ادارہ)

سوالات

1. ابنِ صفی کا اصل نام کیا تھا اور وہ کہاں پیدا ہوئے؟
2. اردو زبان و ادب میں ابنِ صفی کیوں مشہور ہیں؟
3. ابنِ صفی کے مستقل کرداروں کے نام لکھیے۔
4. جاسوسی ادب میں ابنِ صفی سے پہلے کن لوگوں نے شہرت پائی؟
5. ابنِ صفی کے ناولوں کی خصوصیات کیا ہیں؟
6. ابنِ صفی کے کچھ مشہور ناولوں کے نام لکھیے۔

© NCERT not to be republished

دادی کا شاندار باورچی خانہ

رسکن بونڈ

پیدائش : 1934 (Ruskin Bond)

رسکن بونڈ ہندستان میں برطانوی حکومت کے آخری دور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا انتقال 1944 میں ہو چکا تھا۔ رسکن بونڈ کا بچپن بڑی حد تک تنہائی کے ماحول میں گزرا۔ لیکن انھوں نے اس ملک کو ہمیشہ کے لیے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ ان کی اسکول کی تعلیم شملہ میں پوری ہوئی۔ اپنی جوانی کی عمر میں کچھ عرصے کے لیے وہ اپنے بزرگوں کے وطن انگلستان میں بھی رہے، لیکن پھر ہندستان واپس آ گئے۔ اب رسکن بونڈ نے دہرہ دون کے قریب مشہور پہاڑی مقام مسوری کو اپنا گھر بنا لیا ہے اور وہیں رہتے ہیں۔

ہندستان کے انگریز ادیبوں میں رسکن بونڈ کے مداحوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ ان میں بچے بڑے سبھی شامل ہیں۔ بچوں کے ادب کی ترقی میں ان کا کردار بہت نمایاں رہا ہے۔

ان کی کتابوں میں 'The Room on the Roof', 'Delhi is not Far' اور Vagrants in the Valley بہت مشہور ہیں۔ رسکن بونڈ کی خودنوشت کا نام Scenes from a Writer's life ہے۔ ان کی کہانیوں پر کچھ فلمیں بھی بن چکی ہیں۔

دیکھا جائے تو دادی کا باورچی خانہ کچھ اتنا بڑا بھی نہیں تھا۔ کم از کم سونے کے کمرے یا ڈرائنگ روم کے برابر تو ہرگز نہیں تھا۔ پھر بھی اسے بڑا ہی کہا جائے گا کہ اس کے ساتھ ایک کوٹھری ملحق تھی۔ ویسے شاندار تو اسے کھانے کی ان چیزوں کی وجہ سے کہا جاتا تھا جو اس کے اندر سے پک کر آتی تھیں۔ جیسے کباب، انواع و اقسام کے سالن، چاکلیٹ کی قندی، مونگ پھلی کی ٹافیاں، جیلی، گلاب جامن، روغن جوش اور پیسڑی، ترکی طرز پر مسالہ بھرے مرغے، بھرے ہوئے انڈے اور بھیڑ کی بھرواں رانیں معہ بھرواں مرغ۔

© NCERT not to be republished

دادی جیسا باورچی سارے شہر میں نہیں تھا۔

ہمارے شہر کا نام تھا دہرہ دون۔ یہ شہر اب بھی ہے لیکن ملک کی آزادی کے بعد پہلے سے بہت زیادہ پھیل گیا

ہے اور آج کل یہاں زیادہ چہل پہل رہتی ہے۔ دادی کا اس شہر میں اپنا گھر تھا۔ ایک بنگلہ نما گھر جو شہر کی سرحد پر بنا ہوا تھا۔ بنگلے کے احاطے میں بہت سے درخت تھے۔ پھل دار درخت جیسے آم، لیچی، کیلے، پپیتے، امرود اور لیموں کے درخت۔ ان کے علاوہ کٹھل کا ایک بہت بڑا درخت بھی تھا جس کا سایہ گھر کی دیواروں پر پڑتا تھا۔

''مبارک ہے وہ گھر جس کی دیوار پر ہو پرانے کسی پیڑ کا نرم سایہ''

دادی کے یہ الفاظ مجھے آج بھی یاد ہیں۔ واقعی یہ ایک خوش نصیب گھر تھا، نو سال کی عمر کے ایک ایسے بچے کے لیے جسے ہر وقت بھوک لگی رہتی تھی۔ اگر پوری دنیا میں کوئی ایسا باورچی نہیں تھا جو دادی جیسا کھانا پکا سکے تو یقیناً دنیا میں کوئی ایسا بچہ بھی نہیں تھا جو میرے جتنا کھا سکے۔ دادی واقعی فرشتوں جیسا کھانا پکا سکتی ہیں، اگرچہ مجھے پتہ نہیں ہے کہ فرشتے کھانا پکا بھی سکتے ہیں یا نہیں۔

سردیوں کی چھٹیوں میں، میں جب بھی بورڈنگ ہاؤس سے آتا تو کم از کم ایک مہینہ دادی کے ساتھ ضرور

گذارتا۔ اس کے بعد باقی کی چھٹیاں گذارنے کے لیے میں اپنے ماں باپ کے پاس آسام چلا جاتا جہاں میرے والد چائے کے باغات میں مینیجر تھے۔ یوں تو چائے کے باغات بھی بڑے پرلطف ہوتے ہیں لیکن مشکل یہ تھی کہ میرے ماں باپ کو کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔ ان کے یہاں ایک خانساماں تھا لیکن وہ روغن جوش کے علاوہ کچھ پکانا ہی نہیں جانتا تھا۔ اب ہر روز روغن جوش کھانے سے تو اچھا بھلا آدمی اُکتا جاتا ہے، میں تو صرف ایک بچہ تھا۔

اسی لیے دادی کے گھر آدھی چھٹیاں گذارنا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ انھیں خود میرا ان کے یہاں آنا پسند تھا کہ وہ اکیلی رہتی تھیں۔ بالکل اکیلی تو نہیں تھیں کیونکہ ان کے یہاں ایک مالن رہتی تھی، نام تھا کانتا۔ وہ نوکروں کے کواٹروں میں رہتی تھی۔ اس کا ایک لڑکا تھا موہن جو تقریباً میری عمر کا تھا۔ اس کے علاوہ دادی کے ساتھ ایک بلّی رہتی تھی سوزی، جس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں تھیں۔ اور ایک کتّا تھا کریزی جو اپنے نام کی رعایت سے دن بھر گھر کے اردگرد پاگلوں کی طرح چکر لگاتا رہتا تھا۔

اور پھر انکل کین تو تھے ہی۔ کین انکل دادی کے بھتیجے تھے۔ جب بھی ان کی ملازمت چھوٹ جاتی (اور ایسا اکثر ہو جاتا تھا) تو وہ دادی کے یہاں رہنے چلے آتے۔ کئی بار صرف اس لیے بھی چلے آتے تھے کہ دادی کے

ہاتھ کا کھانا کھانے کو جی چاہنے لگتا تھا۔ اگر چہ دادی اکیلی نہیں تھیں، پھر بھی وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ صرف اپنے لیے کھانا پکانے میں کیا مزہ۔ کھانا تو وہ ہوتا ہے جو کسی کے لیے پکایا جائے۔ یوں تو ان کی بلّی، کتّا اور کبھی کبھی کین انکل بھی ان کے کھانے کی تعریف کر دیتے تھے۔ لیکن ایک اچھا باورچی ہمیشہ ایک بچے کو کھلا کر بہت خوش ہوتا ہے۔

دادی جب بھی کوئی نئی چیز پکا کر مجھے کھلاتی تھیں تو میری طرف دیکھتی رہتی تھیں کہ مجھے وہ چیز کیسی لگی۔ میری رائے کو وہ ایک کاپی میں لکھ لیتیں۔ جب وہی چیز وہ دوسروں کو کھلاتی تھیں تو میری رائے ان کے بہت کام آتی تھی۔

میں جب دو چار چمچ کھا لیتا تو وہ پوچھتیں ''اچھی لگی؟''

''ہاں دادی''

''میٹھا ٹھیک تھا؟''

''ہاں دادی''

''بہت زیادہ تو نہیں تھا؟''

''نا دادی''

''تھوڑی اور لوگے؟''

''ہاں دادی''

''تو پھر کھا جاؤ ساری۔''

''جو حکم۔''

بھنی ہوئی بطخ دادی کی پسندیدہ ڈش تھی۔

پہلی بار جب میں نے دادی کے یہاں بھنی ہوئی بطخ کھائی تو کین انکل بھی وہیں تھے۔ کین انکل ریلوے

© NCERT not to be republished

میں گارڈ تھے۔ اُن دنوں ان کی نئی نئی نوکری چھوٹی تھی اور وہ دوسری نوکری کے ملنے تک دادی کے یہاں رہنے کو آئے ہوئے تھے۔ عام طور پر وہ اس دن کھسک لیتے تھے جب دادی کہتی تھیں کہ میں تمھیں پادری داس کے ننھے بچوں کے اسکول میں ماسٹر لگوا دیتی ہوں۔ کین انکل کو ننھے بچوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ننھے بچوں کو دیکھ کر ہی انھیں گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ ویسے تو وہ مجھے دیکھ کر بھی گھبرا جاتے تھے لیکن میں تو بس ایک ہی تھا۔ اور پھر دادی جو موجود تھیں ان کے بچاؤ کے لیے۔ اور پادری داس کے یہاں تو سو سے اوپر ننھے بچے تھے۔

کین انکل کو بھوک خوب لگتی تھی وہ تقریباً میرے جتنا ہی کھاتے تھے۔ وہ کبھی بھی دادی کے کھانوں کی تعریف نہیں کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں کبھی کبھی ان سے ناراض ہو جاتا تھا اور انھیں پریشان کر کے خوش ہوتا تھا۔

کین انکل نے اپنے سامنے رکھی بھنی ہوئی بطخ کو اپنی عینک کو ناک کے آخری کونے تک لے جا کر دیکھا اور بولے:

''چچی نے، آج پھر بطخ پکا دی''

''پھر سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ اس سے پہلے بطخ میں نے تب پکائی تھی جب تم پچھلے مہینے یہاں آئے تھے۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ کم از کم تم سے تو میں توقع کرتا ہوں کہ کھانے میں کوئی نئی چیز پکے۔''

اس اعتراض کے باوجود کین انکل نے پوری بطخ بمعہ اس کے اندر بھری ہوئی چیزوں کے اپنی پلیٹ میں ڈال لی اور میرے لیے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ میں نے ان کی اس حرکت کا بدلہ اس طرح لیا کہ سیب کی چٹنی کی پوری بوتل اپنی پلیٹ میں الٹ لی۔ کین انکل کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میں بطخ کے اندر بھری ہوئی چیزوں کو بڑے شوق سے کھاتا ہوں۔ مجھے بھی پتہ تھا کہ کین انکل سیب کی چٹنی کے کس قدر دیوانے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ایک دوسرے سے بدلہ لے لیا۔

''کیوں بھئی ماں باپ کے پاس کب جا رہے ہو؟'' کین انکل نے مربہ کھاتے ہوئے پوچھا۔

''میں شاید اس بار نہ جاؤں۔ اور انکل آپ کو نئی ملازمت کب مل رہی ہے؟''

''میں تو دو ایک مہینے آرام کرنے کی سوچ رہا ہوں۔''

برتن صاف کرنے میں دادی اور نوکرانی کی مدد کرنے میں مجھے بہت لطف آتا تھا۔ جب ہم برتن صاف کر رہے ہوتے تو کین انکل یا تو برآمدے میں لیٹ کر آرام کرتے یا پھر ریڈیو سننے بیٹھ جاتے۔

ایک دن کین انکل کی پلیٹ کی ہڈیاں کتّے کی رکابی میں ڈالتے ہوئے دادی نے مجھ سے پوچھا۔''تمھیں کین انکل کیسے لگتے ہیں؟''

''وہ اگر کسی اور کے انکل ہوتے تو زیادہ اچھے لگتے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اتنا برا تو نہیں ہے۔ بس تھوڑا سا سنکی ہے۔''

''سنکی کیا ہوتا ہے دادی؟''

''تھوڑا سا کریزی۔''

اپنا کریزی کم از کم گھر کے ارد گرد تو دوڑتا رہتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

© NCERT not to be republished

''کین انکل کو تو میں نے کبھی دوڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

لیکن ایک دن میں نے انھیں دوڑتے ہوئے دیکھ لیا۔

میں اور موہن آم کے درخت کے سایے میں کھیل رہے تھے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کین انکل دوڑ رہے ہیں اور ان کے پیچھے شہد کی مکھیاں دوڑ رہی تھیں۔ ہوا یوں کہ وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس

درخت پر لگے شہد کے ایک چھتے کی مکھیوں کو ان کا وہاں بیٹھنا اچھا نہیں لگا اور انھوں نے ان پر دھاوا بول دیا۔ کین انکل نے مکان کے اندر گھس کر ٹھنڈے پانی کے ٹب میں پناہ لی۔ انھیں بس دو ایک مکھیوں نے ہی کاٹا تھا۔ پھر بھی انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ تین دن تک بستر میں پڑے رہیں گے۔ نوکرانی انھیں وہیں کھانا دے آتی تھی۔

میں نے اس دن دادی سے کہا: ''دادی مجھے معلوم نہیں تھا کہ کین انکل اتنا تیز دوڑتے ہیں۔''

''قدرت اسی طرح ہمیں سبق سکھاتی ہے بیٹا۔''

''کیا مطلب؟''

''دیکھو نا اب کین انکل کو پتہ چل گیا کہ وہ واقعی دوڑ سکتے ہیں۔ ہے نا یہ کمال کی بات۔''

(رسکن بونڈ)

© NCERT not to be republished

سوالات

1. دادی کا باورچی خانہ کیسا تھا؟
2. مصنّف اپنی چھٹیاں گذارنے کہاں چلا جاتا تھا؟
3. دادی کے کتّے اور بلّی کا کیا نام تھا؟
4. دادی کی پسندیدہ ڈش کونسی تھی؟
5. کین انکل کون تھے اور وہ کس چیز کے دیوانے تھے؟
6. قدرت نے کین انکل کو کس طرح سبق سکھایا؟

© NCERT not to be republished

ایورسٹ کی فتح

بچھندری پال

پیدائش : 1954

بچھندری پال کا سال پیدائش 1954 ہے۔ ان کے والد ہندوستان اور تبت کی سرحد پر اناج کے

بیوپاری تھے۔ شادی کے بعد انھوں نے اتر کاشی (اتراکھنڈ) کے مقام پر رہائش اختیار کر لی۔ وہیں بچھندری پال کا جنم ہوا۔ بچھندری کو قدرتی مناظر، خاص کر پہاڑوں سے فطری دل چسپی تھی۔ مزاجاً وہ بہت حوصلہ مند اور نڈر تھیں۔ انھوں نے اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سنسکرت میں ایم۔اے، پھر بی ایڈ کا امتحان پاس کیا۔

1982 میں انھوں نے اپنی کوہ پائی کے شوق کی وجہ سے گنگوتری اور رودوگیرا کی بلندی تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی۔ 1984 میں وہ ایورسٹ کی مہم پر جانے والی ٹیم میں شامل ہوگئیں اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوئیں۔ بہت دنوں تک وہ ٹاٹا اسٹیل فاؤنڈیشن میں ڈپٹی ڈویژنل مینیجر کے عہدے پر فائز رہیں۔ یہ سبق ان کی آپ بیتی سے لیا گیا ہے۔

ایورسٹ کے لیے ہماری ٹیم 7 /مارچ کو دہلی سے کٹھمنڈو کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہوئی۔ کٹھمنڈو میں چندروز قیام رہا پھر ہم زیری کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں سے ہم مزے میں پیدل سفر کرتے ہوئے آٹھ دن میں نامچے بازار پہنچے۔ نامچے بازار شیرپا لینڈ کا اہم قصبہ ہے۔ یہیں میں نے پہلی بار ایورسٹ کو دیکھا تھا۔ نیپالی لوگ اسے 'ساگرمتھا' کہتے ہیں۔ ایورسٹ پر ٹکٹکی باندھے ہوئے میں برف کے ایک بہت بڑے طرّے کو دیکھ سکتی تھی جو چوٹی سے ایک پھریرے کی طرح لہراتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ برف کا یہ پھریرا دس کلومیٹر یا اس سے بھی زیادہ لمبا ہوسکتا ہے۔

© NCERT not to be republished

ایک دن یہاں رُکنے کے بعد ہم مشہور تھیانگ بوچھے مٹھ پہنچے۔ یہاں لاما نے ہمارے لیے کامیابی اور بخیریت واپسی کے لیے دعا مانگی۔ ہم نے یہاں دو روز قیام کیا۔ اس کے بعد ہم پھر تیچے پہنچے۔

26/مارچ کو جب ہم پھر تیچے پہنچے تو ہمیں ایک دہشت انگیز خبر ملی۔ برفانی جھکڑ میں ایک شیرپا قلی ہلاک ہو گیا تھا۔ ہماری مہم کے سربراہ کرنل کھُلّر نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ اس خبر نے ہم سبھی کو افسردہ کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا: ''کسی ایک حادثے سے ہمیں بے جا حد تک پریشان نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی اپنے ارادے میں کوئی کمزوری آنے دینا چاہیے۔''

صدر کیمپ پہنچنے سے پہلے ایک خراب خبر اور ملی تھی۔ کچن کے ایک ملازم کی موت ہو گئی تھی۔ رات کو ہم نے پڑاؤ گورکھ شیپ میں پڑاؤ ڈالا۔ ایوریسٹ چوٹی کو میں دو بار پہلے بھی مگر ذرا فاصلے سے دیکھ چکی تھی۔ اگلے دن صدر کیمپ پہنچنے پر میں نے ایوریسٹ پہاڑوں کے گٹھے ہوئے سلسلے اور اس کے ذیلی سلسلوں کو دیکھا۔ میں مبہوت کھڑی جمی ہوئی برف کے بے ترتیب ٹھوس دریا کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ ہم کھمبو گلیشیر کو ایک کلومیٹر سے کم فاصلے سے تقریباً چھ سو میٹر نیچے گرتا ہوا دیکھ سکتے تھے۔ گلیشیر یا برفشار جمی ہوئی برف کے میناروں اور تودوں کا گڈمڈ آبشار سا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ گلیشیر کی نقل وحرکت سے اکثر برف میں زلزلے بپا ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں برف کی بڑی بڑی سِلیں وغیرہ تیزی سے نیچے گرنے لگتی ہیں۔

پہلا کیمپ چھ ہزار میٹر کی بلندی پر برفشار کے بس ذرا اوپر تھا۔ میں جلد سے جلد برفشار کے قریب پہنچنا چاہتی تھی۔ اسی شام میں اپنے بعض ساتھیوں کے ساتھ اس مقام تک جا پہنچی۔ ماہ اپریل میں جب میں صدر کیمپ میں تھی، تین سنگھ اپنی سب سے چھوٹی بیٹی وکی کے ساتھ کیمپ میں تشریف لائے تھے۔ جب میں نے ان کو بتایا کہ میں قطعی نومشق ہوں اور ایوریسٹ پر چڑھائی کی یہ میری پہلی مُہم ہے تو انھوں نے ہنس کر کہا ''ایوریسٹ میری بھی پہلی مہم تھی لیکن چوٹی پر پہنچنے میں میں اپنی ساتویں کوشش میں کامیاب ہوا تھا۔''

15/16 مئی کو بدھ پورنیما تھی۔ اس رات ہم لہوتسے کی برفیلی پرتوں والی سیدھی ڈھلان پر خیمہ انداز تھے۔

اس کیمپ میں میرے علاوہ دس افراد اور تھے۔ میں گہری نیند میں تھی۔ ساڑھے بارہ بجے کا عمل ہوگا کہ اچانک کوئی بھاری شے بڑے زور سے میرے سر کے پچھلے حصّے پر آ کر لگی جس نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا اور اس کے ساتھ ہی بڑا بھیانک دھماکہ ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کسی بھاری شئے کے نیچے دبی چلی جا رہی ہوں۔ وہ شئے مجھے کُچلے دے رہی ہے۔ میں بہ مشکل سانس لے پا رہی تھی۔

آخر ہوا کیا تھا؟ لہوتسے گلیشیر کی برف کی ایک بڑی لاٹ جو ہمارے کیمپ کے عین اوپر تھی، ٹوٹ کر نیچے آ گری تھی۔ برف کے بے پناہ بڑے تودوں نے جمی ہوئی برف کو پاش پاش کر دیا تھا اور یہ تودے عمودی ڈھلان سے کسی ایکسپریس گاڑی کی رفتار سے اور بہرہ کرنے والی گھن گرج کے ساتھ نیچے گرنے لگے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کو چوٹیں آئیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم میں سے کوئی ہلاک نہیں ہوا تھا۔ لوپسانگ نے اپنے سوئس چاقو کی مدد سے کسی طرح خیمے کو چاک کر دیا۔ وہ اس میں سے باہر نکل آیا اور فوراً ہی مجھے بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اگر ذرا سی تاخیر اور ہوتی تو موت یقینی تھی۔

سارے خیمے تہس نہس ہو گئے تھے۔ کچن والا خیمہ البتہ صحیح سلامت تھا۔ میں اور لوپسانگ ہاتھ پیروں کے بل چلتے ہوئے وہاں پہنچے۔ اس وقت تک سبھی کچن والے خیمے میں یا اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے اپنے اولین طبّی امداد والے تھیلے سے ہر ایک کو درد دور کرنے والی گولیاں دیں۔ ان کے لیے گرما گرم چائے بنائی۔ میں نے کسی کی مدد کی تھی۔ اس احساس نے حواس پر طاری افسردگی اور بے دلی کو پرے جھٹک دیا۔

ہم نے صبح ہونے سے بہت پہلے ہی برف کھود کھود کر اپنا سامان نکالنا شروع کر دیا۔ جلد ہی امدادی ٹیمیں آ پہنچیں اور 16 رمئی کے آٹھ بجے تک ہم تقریباً سبھی دوسرے کیمپ میں پہنچ چکے تھے۔ چوٹ لگنے سے میرے سر کے پیچھے جو گومڑ سا بن گیا تھا، اب دُکھنے لگا تھا۔ لیکن میں نے اپنی تکلیف کسی کو بتائی نہیں۔ ہماری ٹیم کے سبھی نو مردوں کو صدر کیمپ بھیجا جانا تھا۔ انھیں سخت چوٹیں آئی تھیں کرنل کھُلّر نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''کیا تم بھی ڈر گئی تھیں؟'' میں نے جواب میں دھیرے سے کہا ''ہاں۔'' ''کیا تم بھی نیچے واپس جانا چاہتی ہو۔'' انھوں نے پوچھا۔ ''ہرگز نہیں۔'' میں نے بلا تامّل جواب دیا۔

چوٹی کو سر کرنے کے لیے جانے والی دوسری ٹیم کی واحد خاتون ممبر ہونے کا شَرف میرے حصّے میں آیا۔ میں صبح سویرے چار بجے اُٹھ بیٹھی۔ کچھ برف پگھلائی اور چائے تیار کی اور بڑا ہلکا پھُلکا ناشتہ کیا۔ ساڑھے پانچ بجتے بجتے میں خیمے سے باہر نکل آئی۔ انگ ڈور جی باہر کھڑا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا ''کیا تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گی؟'' مجھے ڈور جی پر البتہ بڑا اعتماد تھا۔ ایسا ہی اعتماد مجھے اپنی قوتِ برداشت اور کوہ پیمائی کی صلاحیت پر بھی تھا۔ ایک بات اور بھی تھی۔ اس وقت کوئی دوسرا چلنے کو تیار بھی نہیں تھا۔ اس وقت صبح کے چھ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ دن پوری طرح نکل آیا تھا، ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ سردی بڑی شدید تھی میں کوہ پیمائی کے لباس میں البتہ اپنے آپ کو گرم اور محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ ہم رسّہ باندھے بغیر چڑھ رہے تھے۔ جمی ہوئی برف سے ڈھکی کھڑی ڈھلانیں شیشے کی چادر کی طرح ٹھوس تھیں۔ ہمیں بار بار ''برف کدال'' کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔ پھر بھی مجھے کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ ہم دو گھنٹے سے کم وقت میں چوٹی کیمپ میں پہنچ گئے۔ انگ ڈور جی نے پوچھا، کیا میں

تھک گئی ہوں اور جب میں نے نفی میں جواب دیا تو اُسے بڑی حیرانی ہوئی اور خوشی بھی۔

جنوبی چوٹی پر پہنچنے کے بعد ہوا تیز ہوگئی تھی۔ شدید پُر پیچ آندھی میں برف کے ذرّات برابر شامل ہو رہے تھے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سلسلۂ کوہ چاقو کی دھار جیسا تھا۔ بال برابر چوک ہوئی اور قصّہ ختم۔ کسی بھی طرف لڑھک سکتے تھے۔ جنوبی چوٹی اور اس حصّے کے درمیان چڑھائی خاص طور پر خطرناک تھی جسے عام طور پر 'ہلاری اسٹیپ' کہتے ہیں۔ انگ ڈور جی نے ہاتھ سے چوٹی کی طرف اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی ایک خوشی سی رگ و پے میں دوڑ گئی۔ منزل اتنی قریب تھی۔ دل میں ایک نیا جوش بھر گیا تھا اور میں محض چند سیکنڈوں میں اسٹیپ کے اوپر پہنچ گئی تھی۔ سورج کی شعاعوں نے برف کو نرم بنا دیا تھا۔ پچھلے کی نسبت اس حصّے پر چڑھنا زیادہ آسان تھا۔

کچھ دیر تک ہم برف کے ذرّات والی تیز آندھی میں کھڑے رہے پھر ہم نے دیکھا کہ آندھی کا زور گھٹنے لگا ہے۔ چند ہی قدم چلنے کے بعد میں نے دیکھا، چڑھائی بس دو چار میٹر اور تھی۔ میرے دل کی دھڑکن رک سی گئی

تھی۔ میں نے محسوس کیا، کامیابی میرے پاؤں چومنے کو ہے۔ اور 23 مئی کو ایک بجکر سات منٹ پر میں ایوریسٹ کی چوٹی پر کھڑی ہوئی تھی۔ میں پہلی ہندوستانی عورت تھی جس نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔

(بچندری پال)

سوالات

1. نامچے بازار کہاں ہے۔ نیپالی لوگ اُسے کیا کہتے ہیں؟
2. مُصنّفہ کے لیے لاما نے کیا دُعا کی؟
3. مُہم کے سربراہ کرنل کُھلّر نے کیا مشورہ دیا؟
4. گلیشیر کیا ہوتا ہے؟
5. مصنّفہ کی ایوریسٹ پر جانے کی کونسی مُہم تھی؟
6. لہوتسے میں مصنّفہ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا؟
7. ہلاری اسٹیپ کیسا تھا؟
8. مصنّفہ کس تاریخ کو اور کس وقت ایوریسٹ کی چوٹی پر پہنچی؟

© NCERT not to be republished

دُنیا کی کہانی

پروفیسر محمد مجیب

پیدائش : 1902 (لکھنؤ) وفات : 1985 (دہلی)

محمد مجیب اردو کے ممتاز نثر نگاروں میں ہیں۔ ان کا اصل میدان تاریخ تھا لیکن اردو میں وہ ڈرامانویس کی حیثیت سے بہت معروف ہیں۔ ان کے دو ڈراموں ''آزمائش'' اور ''خانہ جنگی'' کو غیر معمولی شہرت ملی۔ مجیب صاحب اردو کے علاوہ فرانسیسی، جرمن اور روسی زبان وادب سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے۔

مجیب صاحب نے ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تدریسی اور انتظامی خدمات انجام دیں اور جامعہ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے چوبیس سال تک اس سے وابستہ رہے۔

یہ اقتباس مجیب صاحب کی بہت مشہور کتاب ''دنیا کی کہانی'' سے ماخوذ ہے۔ اس میں انھوں نے دنیا کے آغاز اور مختلف مخلوقات کے بارے میں واقعات کو نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کا انداز بہت دلچسپ اور آسان ہے۔ اسے پڑھ کر دنیا کی ابتدا اور انسان کے سفرِ ارتقا کا حال معلوم ہوتا ہے۔

دنیا کی کہانی ایک عجیب داستان ہے کہ جس کی زبانی بیان ہو اُسی کے مطلب کی ہو جاتی ہے اور بہت چھوٹی بھی۔ بہت سیدھی سادی اور بہت الجھی ہوئی۔ وہ ہمیں دلاسا بھی دیتی ہے اور اُداس بھی کرتی ہے۔ لُبھاتی بھی ہے اور ڈراتی بھی ہے۔ وہ اُن کہانیوں کی طرح ہے جنھیں بچّے ضد کر کے رات کو سونے سے پہلے سنتے ہیں اور سنتے سنتے سو جاتے ہیں۔ وہ کہیں سے شروع نہیں ہوتی اور کہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ اس میں جو سچّی باتیں ہیں وہ کہانی معلوم ہوتی ہیں اور بہت سی باتیں جنھیں ہم سچ سمجھتے ہیں جی بہلانے کے قصّے ہیں۔ وہ ہم میں سے ہر ایک کی آپ بیتی بھی ہو سکتی ہے اور ایک تماشا بھی ہے کہ جس میں آدمی کی صورت کی بس ایک جھلک سی دکھائی دیتی ہے، ایسی کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اُسے دیکھا یا نہیں دیکھا۔

تو میں اس کہانی کو، جس کا سرا کہیں نہیں ملتا کہاں سے شروع کروں؟ اُس وقت سے جب دنیا پیدا ہوئی؟ یعنی کب سے؟ بچّوں کو تو ہم سمجھا دیتے ہیں کہ اس دنیا کو خدا نے بنایا۔ کب بنایا؟ کیسے بنایا؟ کیوں بنایا؟ یہ ہم نہیں جانتے اس لیے کہ ہم خود جانتے نہیں۔ لیکن ہر زمانے میں عقل مند لوگ اپنی لاعلمی کو چھُپانے اور کم سمجھ رکھنے والوں کی تسکین

کے لیے کوئی نہ کوئی دلچسپ کہانی سنا دیتے ہیں۔ سنسار کے بھیدوں پر کوئی ایسا خوبصورت پردہ ڈال دیتے ہیں کہ ہم پردے کو دیکھتے رہ جائیں اور یہ پوچھنا بھول جائیں کہ اس کے پیچھے کچھ ہے بھی یا نہیں۔ آج کل کے عقل مند لوگ کہتے ہیں کہ ہماری دنیا پہلے آگ کا ایک گولا تھی۔ اُس آگ کا نہیں جو ہمارے گھروں میں جلتی ہے، اس آگ کا بھی نہیں جو ہمارے دلوں کو گرم رکھتی ہے اور کبھی کبھی جلا کر بھسم بھی کر دیتی ہے۔ یہ ایک اور ہی آگ تھی جو بن جلائے جلی اور بن بجھائے بُجھ گئی۔ شاید یہ وہ چیز تھی جسے ہم بجلی کہتے ہیں؟ شاید نہیں تھی لیکن کبھی نہ کبھی دنیا آگ کا گولہ تھی ضرور، کیوں کہ ہمیں ایسے لاکھوں اور کروڑوں آگ کے گولے آسمان میں چکّر کھاتے دکھائی دیتے ہیں اور ہماری زمین پر اب بھی آتش فشاں پہاڑ جب چاہتے ہیں تو دہکتی آگ اُگل دیتے ہیں یا زمین کے اندر سے کھولتے پانی کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ دوسرے آگ کے گولے جو دنیا سے بہت زیادہ بڑے اور بہت زیادہ پُرانے ہیں، اب تک آگ ہی آگ ہیں۔

دنیا میں یہ آگ پانی اور زمین کیوں بن گئی؟ یہ ہمیں نہیں معلوم۔ بس ہماری قسمت میں یہی کچھ لکھا تھا۔

ہاں تو پھر ایک وقت آیا جب دنیا سرد پڑ گئی، بھاپ اور دوسری گیسیں پانی ہو گئیں، جو زیادہ سخت حصّہ تھا وہ چٹان بن گیا۔ یہ سب ہوا کب؟ آج کل کے عقل مند زمین کی ساخت سے، چٹانوں اور دھاتوں سے کچھ حساب لگا سکتے

ہیں۔ لیکن یہ حساب سنکھ دس سنکھ برس سے بھی آگے نکل جاتا ہے اور ہم ایسے ہیں کہ کل پرسوں کی بات بھی بس یوں ہی سی یاد رکھتے ہیں۔ بے چارے آدمی کی کھوپڑی میں سائنس کا یہ حساب سما نہیں سکتا۔ اور جب سما نہیں سکتا تو اسے یہ حساب بتانے سے کیا فائدہ؟ لیکن عقل مندی بھی ایک چیز ہے اور شاید یہ بھی ایک طرح کا علم ہے کہ جس میں آدمی کہہ سکے کہ میں جانتا ہوں مگر سمجھتا نہیں، اس لیے کہ میری سمجھ چھوٹی ہے اور علم بہت بڑا۔ میں اپنے چُلّو سے اِس سمندر کو ناپ نہیں سکتا تو نہ سہی پر میں جانتا تو ہوں کہ اس میں کتنے چُلّو پانی ہے۔ اور کوئی میرے حساب کو غلط ثابت نہیں کر سکتا۔ سائنس کا حساب بالکل چوکس ہے، فرق نکلا بھی تو کروڑ دس کروڑ کا ہوگا اور وہ کوئی بات نہیں۔ لیکن کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ایسا حساب کتاب کرنے والوں سے وہ لوگ زیادہ سمجھتے اور زیادہ جانتے ہیں جن کا یہ ایمان ہے کہ اس دنیا

جہان کو خدا نے بنایا اور اس کا ہر ذرّہ اس کی قدرت کا کرشمہ ہے، اور اب تو وہ سائنس داں بھی جو اپنے علم کو ایک ڈھکوسلا نہیں بنانا چاہتے، کہتے ہیں کہ ہمارا حساب کا طریقہ ایک خاص حد کے آگے کام نہیں دیتا۔ ہم اپنے علم سے نہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ سورج چاند، تارے اور ہماری یہ دنیا خود بخود پیدا ہوگئی، نہ یہ کہ اُسے کسی نے پیدا کیا۔

جب دنیا سرد پڑ گئی تھی تو کہیں سے سمندر کی تہہ میں زندگی کا بیج پہنچ گیا۔ وہاں وہ پھٹا اور پھولا پھلا۔ لاکھوں

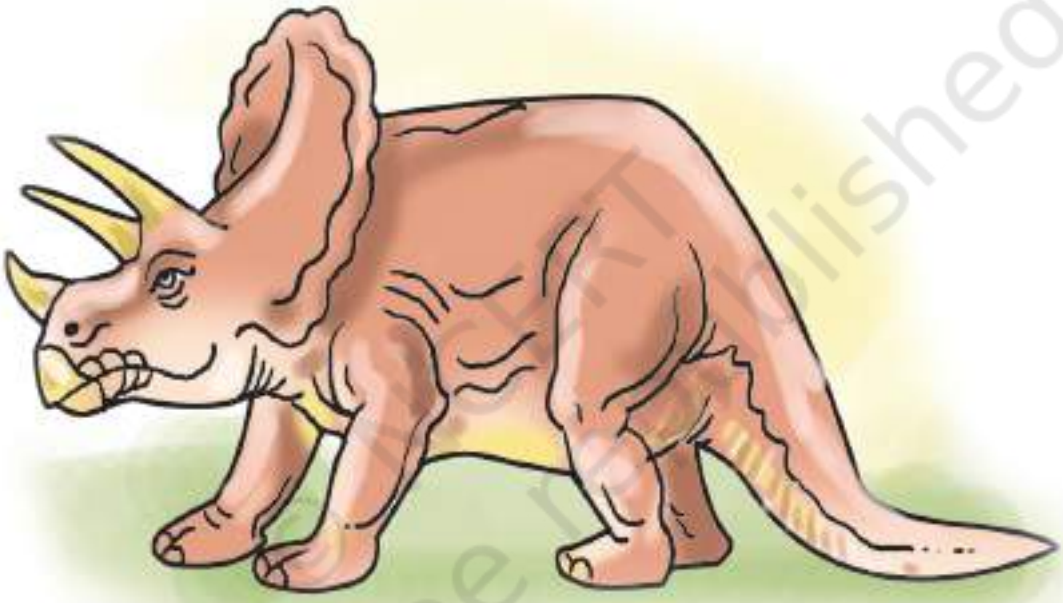

کروڑوں برس اس نے طرح طرح کے بھیس بدلے، آہستہ آہستہ یعنی وہی لاکھوں کروڑوں برس میں اس نے پودوں اور کیڑوں کی صورت میں خشکی کی طرف قدم بڑھایا۔ پانی کے بغیر یعنی سانس لے کے زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کی۔ پودے اونچے ہونے لگے اور سر اُٹھا کر آسمان کی طرف لپکے۔ جو کیڑے تھے وہ مچھلی بن کر تیرے، اُتھلے پانی میں پاؤں کے بل چلنے لگے۔ خشک زمین پر رینگنا شروع کیا، ہوا میں پرند بن کر اُڑے، چوپایوں کا روپ لے کر دوڑنے پھرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ اُتھلے پانی اور خشکی میں زندگی نے جو یہ ابتدائی شکلیں پائیں وہ بڑی بھیانک تھیں۔ چالیس پچاس فیٹ لمبے مگرمچھ، بیس بیس ہاتھ اونچے ہاتھی، کسی جانور کی گردن اتنی لمبی کہ ہوا میں اُڑتے پرندوں کو پکڑ لے، کسی کا مُنہ اتنا

بڑا کہ آج کل کی گائے بھینس کو نگل جائے اور ڈکار نہ لے۔ ایک جانور کی ہڈّیاں ملی ہیں جو مُنہ سے دُم کے سرے تک سوفیٹ سے زیادہ لمبا ہوگا۔ ان جانوروں کو جو نام دیے گئے ہیں وہ بھی ایسے ہی بھیانک برنٹوسورس (BRONTO SAURUS)، اکتھیوسورس (ICHTHYOSAURUS)، میگیلوسورس (MEGALOSAURUS) وغیرہ۔ لیکن دنیا کو شاید اپنی یہ اولاد پسند نہ تھی، یا یہ جانور بڑھتے بڑھتے ایسے بے ڈول ہو گئے کہ زندہ رہنا دشوار ہو گیا۔ بہرحال وہ غائب ہو گئے اور جب تک آج کل کے سائنس دانوں کو ان کی ہڈّیاں نہیں ملیں، کسی کو پتہ بھی نہ تھا کہ ایک زمانے میں ایسے دیو اور اژدہے ہماری دنیا میں آباد تھے۔

خشکی پر ان بڑے جانوروں کے بعد جو نئے نمونے نظر آئے وہ تھے تو ایسے ہی ڈراؤنے، مگر ان میں آج کل کے جانوروں کی طرح یہ صفت تھی کہ وہ اپنے بچّوں کو شروع میں دودھ پلا کر پالتے تھے۔ ایسے جانور شاید اس لیے کہ وہ

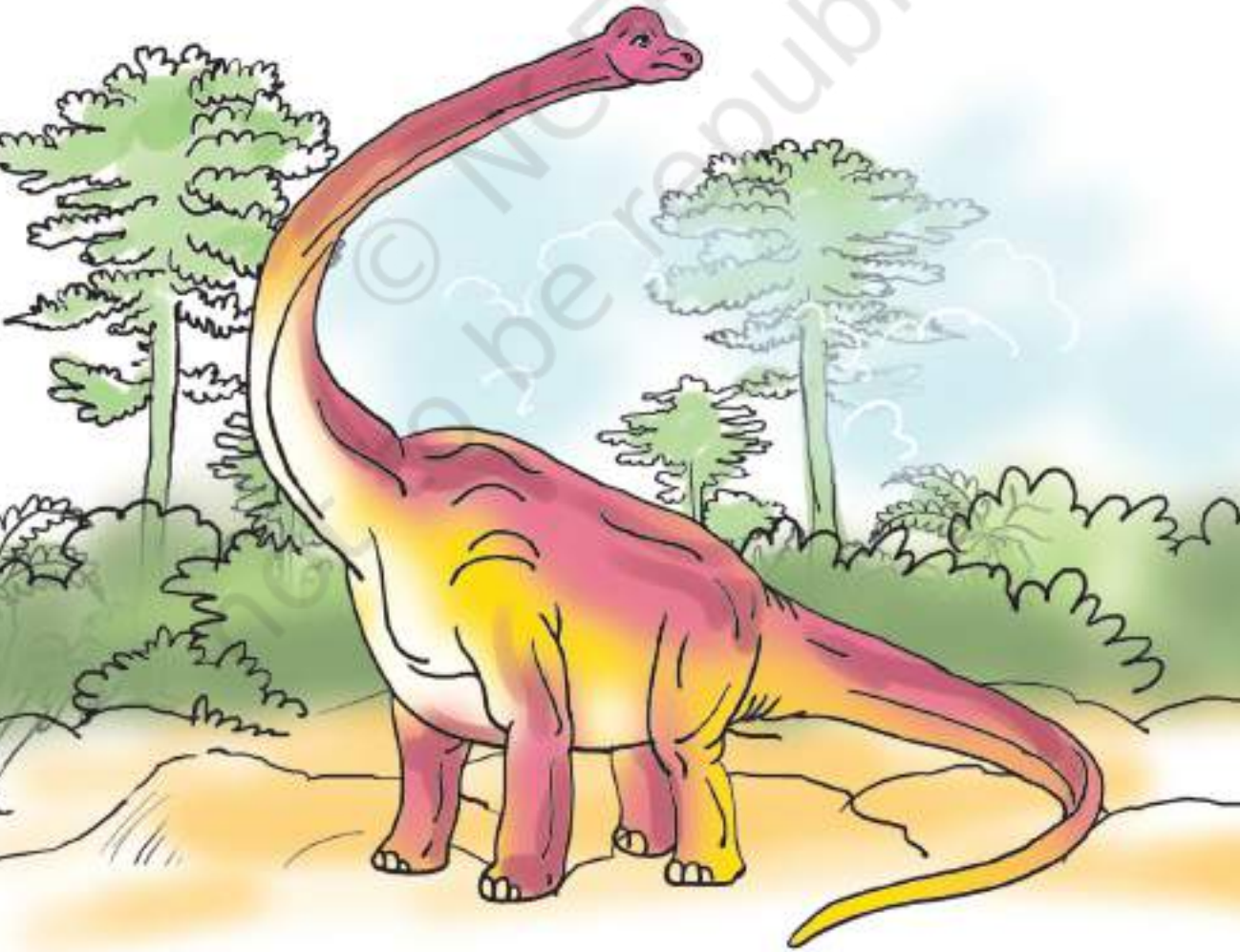

© NCERT not to be republished

غولوں میں رہتے تھے، ماں باپ کو اولاد سے محبت تھی اور وہ اپنے بچّوں کی حفاظت کرتے تھے۔ پہلی قسم کے جانوروں سے زیادہ سخت جان نکلے اور دنیا کی مصیبتوں کو جھیل لے گئے پھر بھی ان کی بہت سی قسمیں مٹ گئیں۔ جو باقی بچیں ان

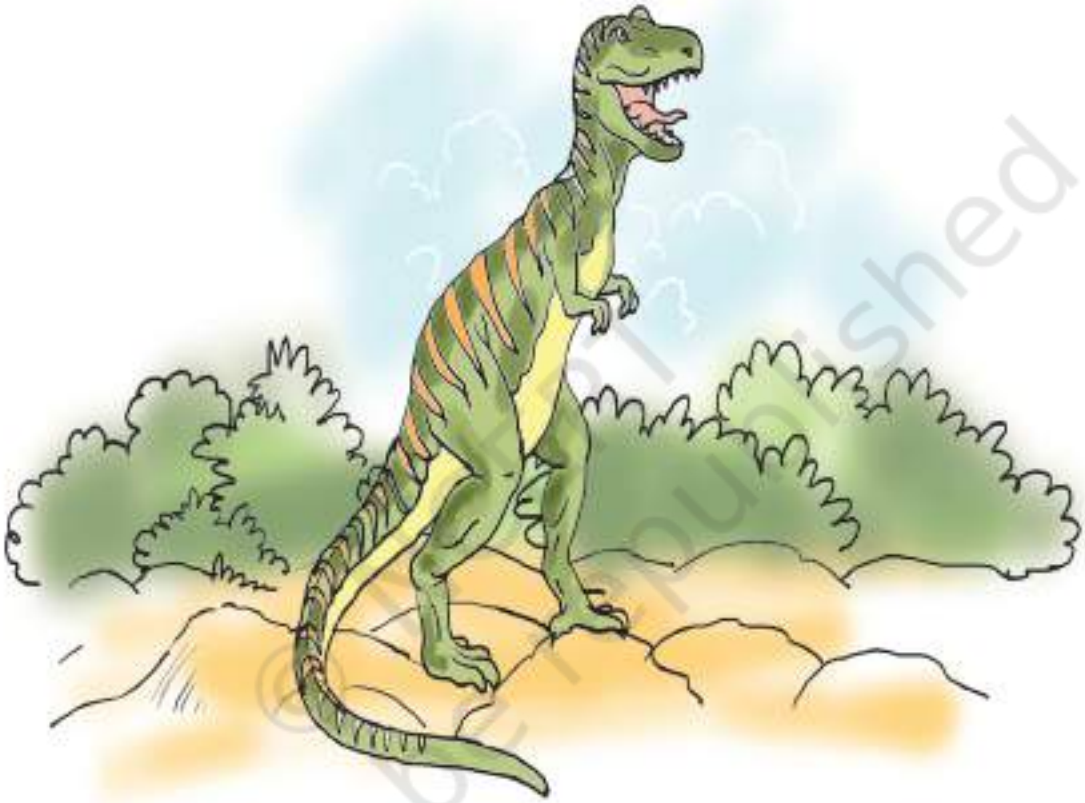

کے بھی جسموں میں ایسی تبدیلیاں ہوتی رہیں کہ وہ موسم کی سختیوں کو زیادہ اچھی طرح برداشت کر سکیں اور دوسرے جانوروں سے اپنی جان بھی بچا سکیں۔ اسی طرح ترقی کرتے کرتے جانوروں کی ایک قسم نے ایسی شکل پائی ہوگی جو آدمیوں کی شکل وصورت سے کچھ ملتی ہوگی۔ جانوروں کی اس قسم کو آسانی کے لیے بن مانس کہہ سکتے ہیں۔ ان بن مانسوں نے چار پیروں کی جگہ دو پیروں سے چلنا سیکھا اور اگلے دو پیروں سے پکڑنے، اُٹھانے اور پھینکنے کا کام لینے لگے۔ قدرت نے ان کی مدد کی اور ان کے اگلے دو پیر پنجوں کی طرح ہو گئے۔ ان کی زبان بھی کُچھ کُھل گئی اور وہ دوسرے جانوروں سے بہت زیادہ ہوشیار ہو گئے۔

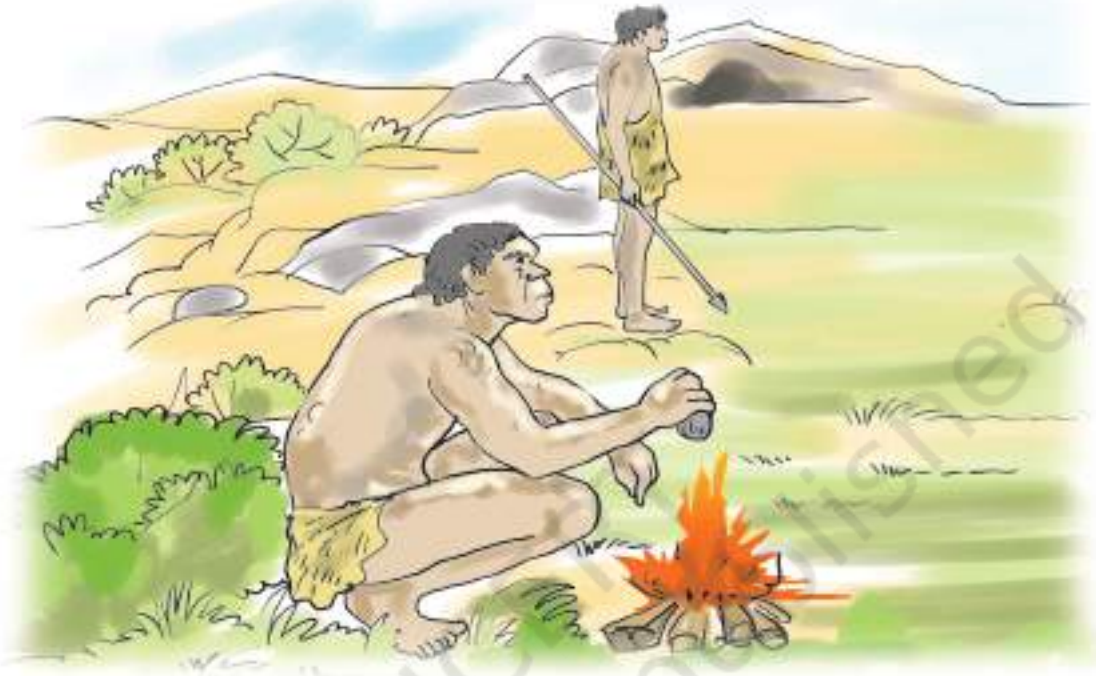

یہ سب ہزاروں برس میں ہوا اور پھر کہتے ہیں کہ دنیا کی آب و ہوا بدلی۔ وہ ایسی ٹھنڈی پڑی کہ اس کا بہت سا حصّہ برفستان ہو گیا اور برف کے کھسکتے اور پھسلتے پہاڑوں نے سب کچھ اپنے تلے روند ڈالا۔ پھر گرمی آہستہ آہستہ بڑھی۔ برفستان پگھل کر سمندر ہو گئے اور زندگی پھر اُبھری اور پھیلی۔ اس طرح چار مرتبہ ہوا اور اس وقت زمین میں کئی سو گز نیچے تک ہمیں جو کچھ ملتا ہے وہ ان ہی گرمی اور سردی کے پھیروں کی داستان سناتا ہے۔

(پروفیسر محمد مجیب)

سوالات

1. دُنیا کی کہانی کو عجیب داستان کیوں کہا گیا ہے؟
2. آج کل کے عقل مندوں کی دنیا کے بارے میں کیا رائے ہے؟
3. عقل مند لوگ سنسار کے بھیدوں پر خوب صورت پردہ کیوں ڈال دیتے ہیں؟

© NCERT not to be republished

4. جب دنیا سرد پڑ گئی تو کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں؟
5. زندگی کے بیج نے سمندر کی تہہ میں پہنچ کر کون کون سے بھیس بدلے؟
6. خشکی پر نظر آنے والے جانوروں کی کیا صفات تھیں؟
7. خشکی پر پائے جانے والے بھیانک جانوروں کو کیا نام دیے گئے ہیں؟
8. ہزاروں برس کے بعد جب دنیا کی آب و ہوا بدلی تو کیا کیا تبدیلیاں نظر آئیں؟

© NCERT not to be republished

نوٹ

© NCERT
not to be republished

نوٹ

© NCERT
not to be republished